www.urducouncil.nic.in

فروری 2021، قیمت :- ₹10

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اُردو دُنیا

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

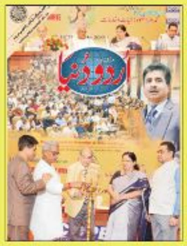

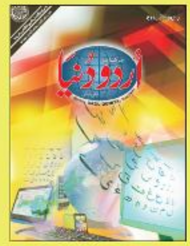

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیش کش

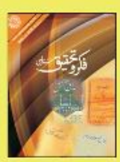

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

بچوں کی دنیا

جلد: 9 شمارہ: 02 فروری 2021

مدیر: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم: اجمل سعید

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارتِ تعلیم۔محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،

جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000

شعبہ ادارت:11-49539009

ای میل

bachonkiduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10 روپے، سالانہ /100 روپے

▪ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت

ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم

نئی دہلی-110066

فون:26109746

ای میل:sales@ncpul.in

ncpulsaleunit@gmail.com

علاقائی مرکز: 22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون:24415194-040

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ
اداریہ	مدیر	04
ڈاک خانہ	قارئین	05
مضامین		
عدیم المثال: لیگسن کایرا	سیدہ نوشاد بیگم محمود	06
فدائے وطن: شہید عبدالحمید	معین الدین شاہین	09
پیڑ ہمارے سچے دوست	رضاء الرحمن عاکف سنبھلی	11
جنگلی جانوروں کا تحفظ	انور ادیب	14
حساب کی دنیا کا انقلابی نام: موسیٰ الخوارزمی	متین الدین	17
مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت	محمد بہلول	19
مکالمہ		
چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی	محمد اسداللہ	22
نظمیں		
بیٹی پڑھاؤ بیٹی بچاؤ	کرشن کمار طور	24
ہوا چیختی ہے	متین اچل پوری	25
بادل	عزیز اللہ شیرانی	26
کورونا ہے	شکیل سہسرامی	27
کمپیوٹر	صبیحہ سنبل	28
چارہ گر تم بننا سیکھو	تنویر اختر رومانی	29
اسکول جاتے ہیں	ضیاء الرحمن جعفری	30
چار بجے	محمد انس مسرور	31
بچہ اور چاند	امان ذخیروی	32
ماحولیاتی انقلاب	محمود اشرف	33
کہانیاں		
اخلاق کی دولت	رونق جمال	34
بنا پاؤں والے پاؤں کے نشان	ایچ جی ویلز، ترجمہ: عظیم اقبال	37
پنجرے کا طوطا	منظر مظفر پوری	41
بدلاؤ	سہیل سالم	43
آبشار	گوہر رفیع شاذ	45
بال گھر کی سیر	ثنا اسد	49
انسانیت اور خودنمائی	فوزیہ خانم عبدالرحمن خان	53
زبان شناسی		
محاورے	سید ضمیر حسن دہلوی	56
صحت اطفال		
بچے کی صحت	ستیہ گپتا، مترجم: شمیم نکہت	57
بچوں کا کتب خانہ		
ایک کوشش	حقانی القاسمی	59
کہکشاں		
چمن چمن کے پھول		61
ننھے فنکار		
بچوں کی پینٹنگ		62

پیارے بچو! سنہ اور سال ضرور بدل گئے ہیں۔ کیلنڈر بھی تبدیل ہوگیا ہے مگر ہماری ذمہ داریاں اور ہمارے مسائل نہیں بدلے ہیں۔ اب نئے سال میں ہمیں نئے مواقع اور امکانات کی تلاش کرنی ہے۔ ہمیں اپنی ذمے داریوں کو اور بھی بہتر طریقے سے انجام دینا ہے۔ اپنے مستقبل کے بارے میں مزید سنجیدگی سے غور کرنا ہے کیونکہ سال کے بدلتے ہی عمر ضرور بڑھ جاتی ہے مگر صحیح معنوں میں زندگی گھٹ جاتی ہے، اس لیے گھٹتی ہوئی زندگی کو دیکھتے ہوئے یہ بھی سوچنا ہے کہ زندگی کے باقی دنوں میں وقت کو کیسے استعمال میں لائیں، کیونکہ وقت کو گزرتے دیر نہیں لگتی اور جو لوگ وقت کا صحیح استعمال کرتے ہیں وہی زندگی میں کامیاب ہوتے ہیں۔ جن لوگوں نے وقت کی قدر نہیں کی وقت بھی ان کی قدر نہیں کرتا۔

پرانے زمانے میں لوگ اپنے قیمتی وقت کو کبھی ضائع نہیں کرتے تھے بلکہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ان کے کام کے لیے وقت کی کمی پڑ جاتی تھی۔ آپ سب نے کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ وہ اپنے وقت کو کیسے استعمال کرتے تھے اور کس طرح معمولات کا کام کرنے کے بعد وہ کتابوں سے اپنا رشتہ جوڑتے تھے۔ سماجی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے، اپنے آس پاس کے لوگوں کا حال چال پوچھتے تھے اور اس طرح بہت سارے کام وہ کرلیتے تھے کیونکہ انھیں اپنی سماجی ذمے داریوں کا بھی احساس تھا اور وقت کی کمی کا بھی۔ اسی لیے وہ غیر ضروری کاموں میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا کرتے تھے۔

پیارے بچو! آج بھی ہماری بہت ساری سماجی ذمے داریاں ہیں جنھیں ہمیں پورا کرنا ہے، خاص طور پر بچوں کے تعلق سے ایسے مسائل ہیں جن پر پورے سماج کو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ بہت خوش نصیب ہیں کہ اسکول یا مکتب میں تعلیم حاصل کررہے ہیں مگر بہت سے بچے ایسے ہیں جو سڑکوں پر، اسٹیشنوں پر اپنے بچپن سے محروم نہایت تکلیف دہ زندگی بسر کررہے ہیں، غربت اور محرومی کی وجہ سے وہ تعلیم حاصل نہیں کرپاتے۔ سڑکوں پر زندگی بسر کرنے والے ایسے بچوں کی بہت بڑی تعداد ہے۔ ان بچوں کے بارے میں بھی سوچنا ہم سب کی ذمے داری ہے۔ آپ بھی کبھی ادھر ادھر جاتے ہوں گے تو بہت سے پھول سے بچے آپ کو سڑکوں اور گلیوں میں مل جاتے ہوں گے۔ آپ ذرا ان کے بارے میں بھی سوچیے کہ ان کی زندگی کس طرح گزرتی ہوگی۔ ان کی زندگی میں ہر وقت درد کے پیوند لگے جاتے ہیں۔ ان کا درد ہم سب کا درد ہے۔ ہمیں ان بچوں کے بارے میں سوچنا ہے اور انھیں تعلیم سے جوڑنا ہے۔ اپنے مستقبل کے ساتھ ان کے مستقبل کی بھی فکر کرنی ہے۔ اس تعلق سے آپ سب بچے اگر بیدار ہوں گے تو یقینی طور پر ان بچوں کی حالت میں بدلاؤ آئے گا اور آپ ہی کی طرح وہ بچے اسکول جائیں گے، تعلیم حاصل کریں گے، ترقی کریں گے اور کامرانی کی ایک نئی تاریخ رقم کریں گے۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاک خانہ

'بچوں کی دنیا' اپنے 8 سال مکمل کررہا ہے۔ شمارہ 12 دسمبر 2020 زیرنظر ہے۔ ابتدا مدیر کے خط سے ہے، بڑوں کی باتیں (ڈاک خانہ) میں خطوط کی اشاعت محمد خلیل کا مضمون 'ایک عظیم سائنسداں بینجمن فرینکلن' معلوماتی مضمون ہے۔ مضمون نگار ایک سائنٹسٹ ہیں اور سائنس کی دنیا کے مدیر رہ چکے ہیں۔ سیدہ خدیجہ صغریٰ بانو کا مضمون 'تندرستی ہزار نعمت ہے' صحت کے لیے پڑھنا ضروری ہے۔ عابد انور کا مضمون 'معذور افراد اور ہمارا معاشرتی رویہ' معذوروں پر ایک اچھا تجزیہ ہے۔ ماہ دسمبر کے لحاظ سے عشرت جہاں کا مضمون 'یوم حقوق انسانی' ہے۔ معروف ناول نگار اور ادیبہ قمر جمالی کی کہانی 'بھائی ٹی ٹی رام' خوب اور پڑھنے لائق ہے۔ دوسری کہانی مالیگاؤں کے نخشب مسعود کی 'الہ دین اور ہمزاد' ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر حلیمہ فردوس کی کہانی 'تعریف کے لڈو' اور عائشہ سمن کی کہانی 'کورونا شہزادی'، چشمہ فاروقی کی کہانی 'موبائل'، باغبان ہارون رشید کی کہانی 'رازِ حیات'، ایاز شاکر ریتھپوری کی کہانی 'ببلو میاں اور دانت کا درد'، نیلوفر سعدیہ کی کہانی 'اعتبار'، توصیف بریلوی کی کہانی 'سیڈ بال' نو کہانیوں کے بعد ڈاکٹر زین الدین حیدر کا ڈراما 'انتظار ہے' جو میڈم مسونا نووا کا ترجمہ ہے۔ بچوں کے کتب خانہ کے تحت حقانی القاسمی نے بچوں کے لیے ہایا نون کی دو کتابوں کا تعارف پیش کیا ہے۔ پہلی کتاب 'قطبی علاقے کیا ہیں' اور دوسری 'کتاب قطبی روشنی کیا ہے'

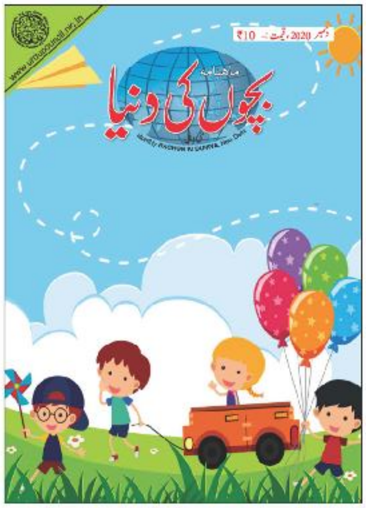

یہ دو کتابیں قومی کونسل کی شائع کی ہوئی ہیں۔ 'زبان شناسی' کے تحت محاورے دیے گئے ہیں جن کی تعداد 16 ہے۔ صحت کے تحت ستیہ گپتا، مترجم شمیم نکہت کا مضمون 'بچے کی صحت'، کہکشاں کے تحت سید وحید الدین پیرزادہ کا 'ڈاک ٹکٹ کا سفر' ہے اور چمن چمن کے پھول کے تحت 11 مشہور شاعروں کے اشعار ہیں۔ ننھے فنکار کے عنوان نے بچوں کی پینٹنگس کو پیش کیا۔

نظم کے تحت کمار پانی پتی کی نظم 'پیارے بچو'، سیفی سرونجی کی نظم 'کتاب'، فیض رتلامی کی نظم 'بچوں کی دعا'، رخشاں ہاشمی کی نظم 'سچ اور جھوٹ'، سہیل عالم کی نظم 'ابو لائے کمپیوٹر'، نوید اختر پروانہ برہانپوری کی نظم 'اٹھو سویرے'، حشمت رضا ساحل کی نظم 'سچ بولو' جملہ سات نظمیں ہیں۔

64 صفحات کے اس رسالے میں چار مضامین، سات نظمیں، نو کہانیاں، ایک ڈراما، بچوں کا کتب خانہ، صحت اطفال، اردو زبان کا جادو، کہکشاں اور ننھے فنکار جیسے مضامین رنگین صفحات پر بکھرے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر مرق سلیم

بہ شکریہ 'صحافی دکن'، حیدرآباد

عدیم المثال: لیگسن کایرا

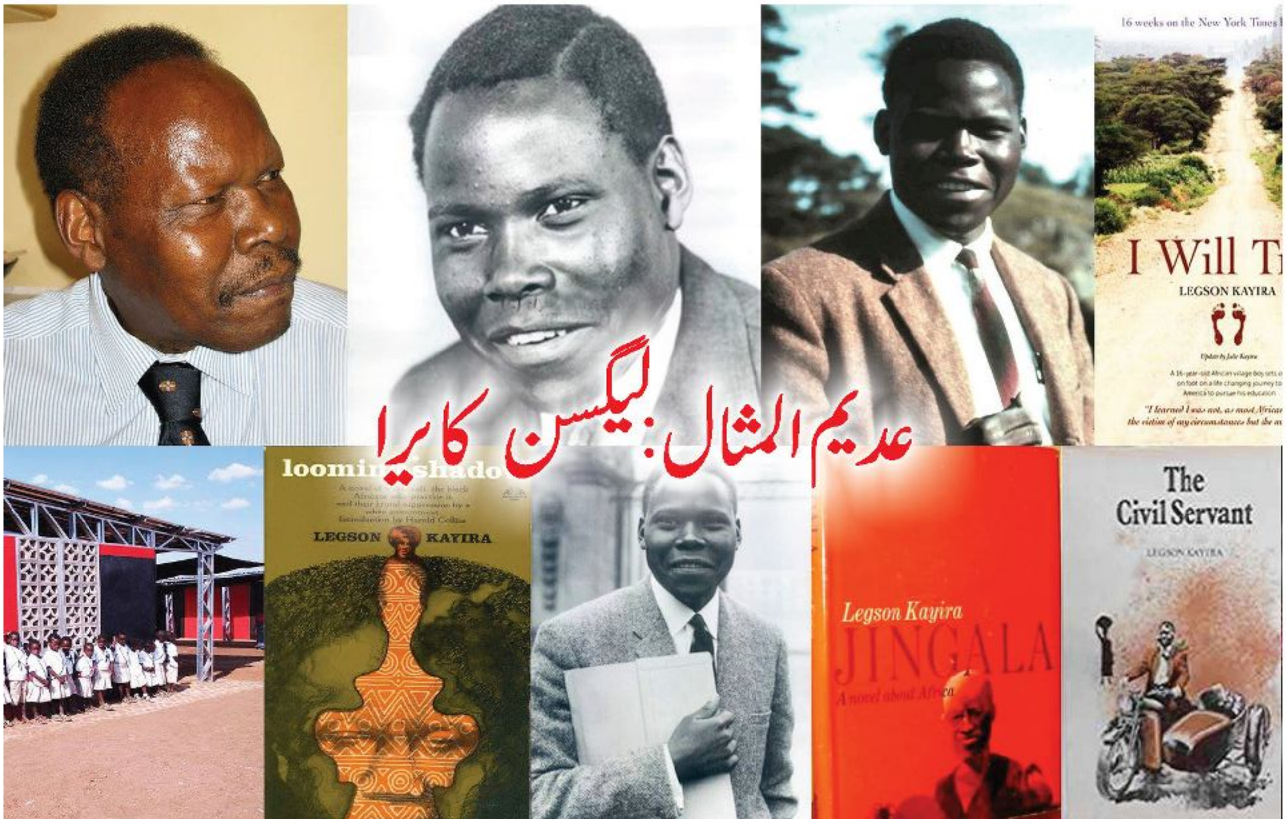

سیدہ نوشاد بیگم محمود

سیدہ نوشاد بیگم محمود درس و تدریس سے وابستہ رہی ہیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت اور رہنمائی کے تعلق سے ان کی بہت سی کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں انتہائی ذہین بچوں کی سات خصوصیات، ہمارے بچے، کامیابی صرف چھ قدم پر، دی آرٹ آف پاور فل کمیونیکیشن، ناقابل تسخیر کارنامے: اے پی جے عبدالکلام، اکیاون تحریک آمیز سوانح حیات، مثبت نظریے سے کامیابی کی سمت، اپنے مستقبل کو روشن کیجیے، کامیابی کی جانب دو قدم، دس سبق آموز کہانیاں اور کون بنے گا کروڑ پتی قابل ذکر ہیں۔

انسان اگر اپنے باطن کی طاقت پر اعتماد رکھے اور مثبت توقعات رکھے تو کسی بھی دشوار گزار حالت میں اپنے ہدف کو پاسکتا ہے۔ بیشتر اوقات ہم دوسروں سے مثبت برتاؤ کی توقع رکھتے ہیں لیکن خود مثبت نظر نہیں ہوتے۔ لیگسن کایرا نے برہنہ پیروں سے نامعلوم امریکہ کا سفر جاری کیا۔ دیگر افراد کی جانب سے بھی انھیں بھرپور تعاون حاصل ہوا۔ سفر کی ابتدا کرتے وقت لوگوں کو میری مدد کرنی چاہیے۔ یہ توقع رکھ کر انھوں نے سفر شروع نہیں کیا تھا بلکہ ان میں زبردست خوداعتمادی پائی جاتی تھی۔ یہ بات ذہن نشیں رہے۔

عمر بھر تجھ کو رکھے گا گرم سفر
منزلوں کو ترا رہ گزر بولنا

(طاہر فراز)

لیگسن کایرا (Legson Kayira) کا جنم 10 مئی 1942 کو افریقہ کے نیسالینڈ کے میپل نامی چھوٹے گاؤں میں ہوا۔ وہ پیدائشی طور پر بہت ہی بھاری بھرکم جسم والے تھے۔ انھیں سنبھالنا ان کی ماں کے لیے بڑا دشوار گزار

کام تھا۔ اس لیے ان کی والدہ نے اس بچے کو ڈیڈو مونڈی میں پھینک دیا لیکن کہتے ہیں نا کہ جسے خدا رکھے، اسے کون چکھے کے مصداق ایک خاتون نے اسے ندی سے باہر نکالا اور اس کی ماں کو لاکر دوبارہ سونپ دیا۔ آگے چل کر اس ندی کے نام پر ان کا نام ڈیڈی مو پڑ گیا۔ بعدازیں انگریزی اسکول میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے اس سرزمین پر انھوں نے لیکسن نام قبول کیا اور لیکسن ڈی ڈی مو کا یرا کے نام سے پہچانے جانے لگے۔

مفلس خاندان میں ولادت

لیکسن کے والدین غیر تعلیم یافتہ اور مفلس تھے۔ لیکسن کی رائے یہ تھی کہ ''خدا کے اب تک بنائے ہوئے سب سے مفلس گھر میں میری پیدائش ہوئی۔'' گائے چرانے لے جانا اور رات کو اناج کے گودام میں سو جانا یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ ان کی نانی لیکن انھیں روزانہ رات میں چند سبق آموز کہانیاں سنایا کرتی۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی زندگی میں انفرادیت کے بیج یہیں پر بوئے گئے ہوں۔ انھوں نے اسکاٹ لینڈ مشنری کے اسکول میں داخلہ لیا۔ ان کے اسکول کی سالانہ فیس چھ پینی تھی۔ کئی مہینوں تک محنت کر کے ان کے والدین کو یہ فیس اکٹھا کرنی پڑی۔ اسکول میں کاغذ، پنسل یا کتابیں بھی فراہم نہیں ہوتی تھیں۔ اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے وقت اساتذہ کا کھانا بھی لانا پڑتا اور ان کے باغات میں کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ بیشتر اوقات بچے پڑھائی کی بہ نسبت راستے باندھنے کے کاموں میں مشغول رہتے۔ اسی لیے اس دیہات کے بچوں کا دھیان پڑھائی کی بجائے جانور چرانے اور انھیں ہانکنے کی جانب زیادہ رہتا۔ لیکسن بھی اسکول چھوڑ دینا چاہتے تھے۔ لیکن اس سال کی مکمل فیس بھر دی گئی تھی اس لیے والدین نے اسے اپنی اسکول کی تعلیم جاری رکھنے کے لیے کہا۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے دوسرا اسکول گاؤں سے تقریباً آٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔ یہ فاصلہ پیدل چلنا ویسے ہی دشوار تھا۔ بارش میں تو یہ کام بڑے جگر کا تھا۔ جسم پر ناکافی لباس ہونے کی وجہ سے اسے اس اسکول میں داخلہ دینے سے انکار کر دیا گیا تھا۔ ان حالات میں بھی لیکسن نے امتحان میں کامیابی حاصل کر کے بتایا لیکن عمر کم ہے یہ وجہ بتا کر آگے کی تعلیم کے لیے پھر سے داخلہ دینے کے لیے انکار کر دیا۔

مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے لیکسن کے پاس پیسے نہ تھے لیکن اس بچے میں تعلیم کی لگن دیکھ کر وہاں کے آفیسر نے کوشش کر کے 200 میل پر موجود چار مدارس میں سے 'کروں گا' نامی مقام کے مشہور اسکول 'لیونگ اسٹونیا' میں اسے داخلہ دلوا دیا۔ بدنصیبی سے اسی دوران اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس کی والدہ اور گاؤں کے دیگر افراد نے اسے اسکول چھوڑ دینے کی صلاح دی لیکن مفلسی سے باہر نکلنے کا ایک ہی راستہ یعنی کہ تعلیم حاصل کرنا یہ لیکسن کا خیال تھا۔ اس کی تعلیمی کارکردگی بھی عمدہ تھی ایسے سنگین حالات میں بھی اس نے چند برس تعلیم جاری رکھی۔ جو بھی کتابیں دستیاب ہو جاتیں اسے لیکسن پڑھ لیتا۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے یہ اس کے ذہن و دل میں امریکہ کے ابراہیم لنکن اور بروکر واشنگٹن کے متعلق زبردست کشش ہوتی گئی۔ 'اپ فرام سیلوری' نامی کتاب نے اسے تجسس میں مبتلا کر دیا تھا اب وہ مدرس بننے کی تربیت حاصل کرنے کی توقع رکھ رہا تھا لیکن اس کے دماغ میں عجیب قسم کی ہلچل مچی ہوئی تھی۔

ایک روز ملک کو آزادی حاصل کروانے کی غرض سے منعقد کیے گئے مورچے میں وہ شامل ہوئے۔ وہاں انھیں ڈاکٹر ہیٹنگ کا موجھؤ کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے کہا تھا کہ ''لنکن کا ملک یعنی کہ امریکہ یہ ایک ایسا مقام ہے کہ جہاں شخصی

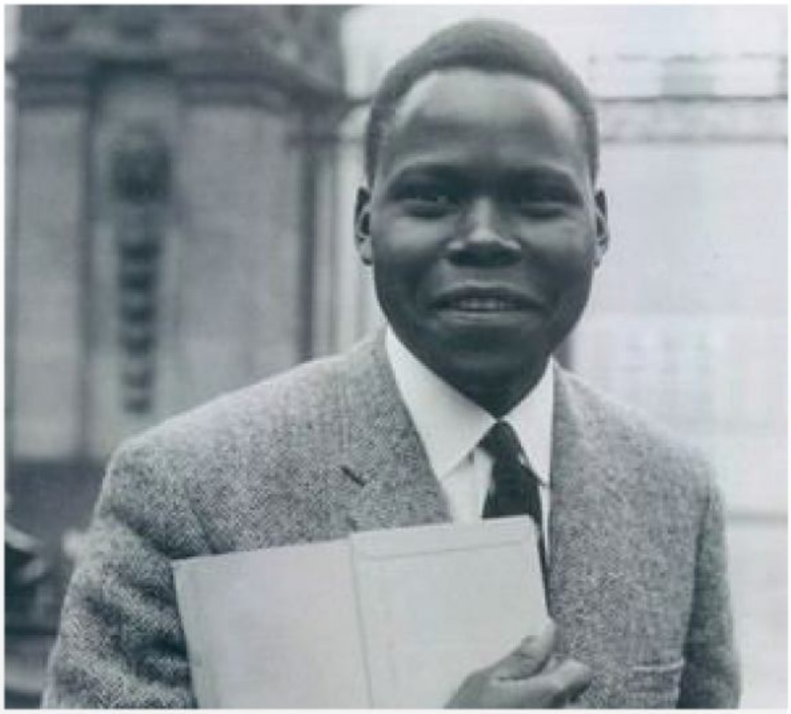

آزادی کو صحیح مفہوم ملا ہے۔ یہاں ہر ایک شخص آزادی سے رہ کر زندگی بسر کرسکتا ہے۔ اسی وقت انھوں نے امریکہ جا کر تعلیم حاصل کرنے کی بات دل میں ٹھان لی تھی۔ میں امریکہ جا کر سند حاصل کروں اور اپنے مادرِ وطن کی بھلائی کے لیے وطن واپس لوٹوں گا۔ یہ یقین انھوں نے مورچے کے روز ہی دل میں مستحکم کرلیا تھا۔ میرے تیسالینڈ میں 30 لاکھ لوگ ہیں لیکن یہاں پر صرف 22 افراد ہی سند یافتہ ہیں۔ امریکہ سے سند حاصل کردہ ایک بھی فرد میرے ملک میں نہیں ہے۔ میں ہی یہ اعزاز سب سے اوّل حاصل کروں یہ بھی ارادہ انھوں نے دل میں مضبوط کرلیا۔ میرے ملک میں پیسوں کی قلت، تعلیم کی کمی اور ناخواندگی زیادہ ہونے کی وجہ سے ملک کے نوجوان بچوں کو روزگار کے ذرائع بھی مہیا نہیں ہیں پھر وہ چوری ڈکیتی کی جانب مائل ہوتے ہیں اور ملک کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ میں لیکسن کچھ منفرد اور عمدہ کام انجام دینا چاہتا ہوں۔ یہ سوچ لیکسن کایرا نے اپنے دل میں طے کرلی۔

اگر بڑا بننا ہے تو امریکہ میں جا کر تعلیم حاصل کرنا بے حد ضروری ہے۔ یہ خیال اس کے دل میں بس گیا لیکن میں امریکہ کس طرح جاسکوں گا؟ جب یہ بات ان کے ذہن میں آئی تو انھیں اس کا صرف ایک ہی جواب مل رہا تھا کہ پیدل جانا ہوگا۔ ایک روز دل میں یقین پکا کرکے انھوں نے امریکہ کی سمت میں چلنا شروع کردیا۔ اس سفر کا خلاصہ انھوں نے اپنے ''آئی وِل ٹرائے'' نامی سوانح عمری میں کیا ہے۔ امریکہ کے باشندوں کی زندگی پر انھوں نے پانچ عمدہ ناولیں تحریر کی ہیں۔ وہ بہت مشہور ہوگئے اور انھیں نارتھ ویسٹ نوٹیفکیشن سے اعزاز بھی عطا کیا گیا۔

کچھ عرصے بعد اس کتاب کے پیپر بیک ایڈیشن بھی شائع ہوئے۔ کئی مقامات پر ولولہ انگیز مصنف کے طور پر ان کی قدر و منزلت ہوئی۔ ان کی کتابوں کے کئی زبانوں میں تراجم ہوئے۔ انھوں نے اپنی تحریروں اور قلم کی مدد سے لوگوں میں بیداری پیدا کی۔

انسان اگر اپنے باطن کی قوت پر اعتقاد رکھے اور خود کی جانب سے مثبت توقعات رکھے تو وہ کیسے ہی حالات کیوں نہ ہوں بہت کچھ حاصل کرسکتا ہے اور عظمت کی بلندیوں کو چھو سکتا ہے۔

آن پڑی مشکل تو گھبرانے سے کیا ہوگا
جینے کی ترکیب نکالو، مرجانے سے کیا ہوگا

(ندیم شاد)

■

Ms. Sayyeda Naushad Begum Mahmood
Shree Darshan Apt. B-203
Mumbai Pune Road, Kalwa
Thane- 400605
Mob.: 9867650210

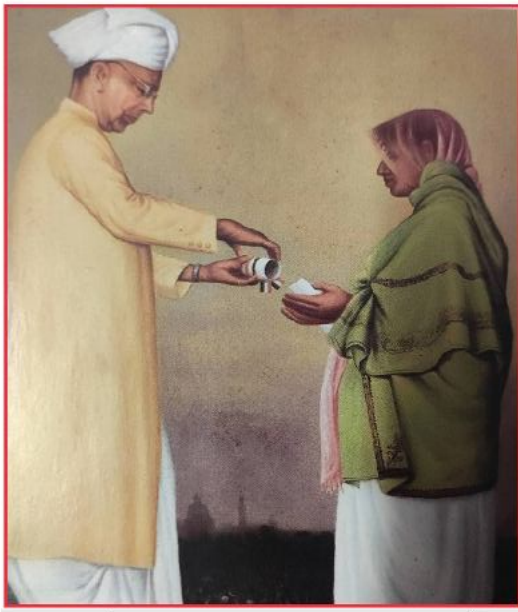

فدائے وطن: شہید عبدالحمید

عبدالحمید کی ولادت صوبہ اتر پردیش کے ضلع غازی پور کے مشہور گاؤں دھاموپور کے ایک پس ماندہ خاندان میں 31 جنوری 1933 کو ہوئی۔

عبدالحمید کے والد کا نام محمد عثمان تھا جو گزر بسر کے لیے کپڑوں کی سلائی کا کام کرتے تھے لیکن عبدالحمید کی اپنے آبائی پیشے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، انھیں تو کشتی کی مشق کرنے، اُچھلتی ندی کو پار کرنے اور غلیل سے نشانہ لگانے میں لطف آتا تھا۔ ان کے والدین نے ان کی تعلیم و تربیت کے لیے جی جان سے کوشش کی اور انھیں حب الوطنی، قومی یکجہتی اور وطن کے تحفظ کا درس دیا۔

عبدالحمید بچپن ہی سے ہونہار تھے۔ ایک مرتبہ کسی غریب کسان کی فصل کو زمین دار لوگ جبراً لے جانا چاہتے تھے لیکن عبدالحمید نے تن تنہا تقریباً پچاس لوگوں کو جانبازی سے مقابلہ کر کے کسان کی فصل کو بچایا۔ اسی طرح جب 1954 میں 'منگئی ندی' نے غازی پور جن پد کے پدم پور اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں تباہی مچا دی تو بقول سید احسان علی عبدالحمید نے اپنی جان پر کھیل کر ستاون لوگوں کو موت کے منہ میں جانے سے بچایا۔

عبدالحمید کی عمر جب 21 برس ہوئی تو انھیں ذریعہ معاش کی فکر ستانے لگی۔ وہ پہلے پہل ریلوے میں ملازمت حاصل کرنے گئے تو انھیں اپنے والدین کا دیا ہوا درس اور نصیحت یاد آئی۔ ان کی والدہ سکینہ بیگم نے انھیں ہمیشہ فوج میں بھرتی ہو کر وطن کے تحفظ کی تحریک دلائی تھی، لہٰذا عبدالحمید ریلوے میں ملازمت کا ارادہ ترک کر کے اسی سال یعنی 27 دسمبر 1954 کو وارانسی بھرتی بورڈ پہنچے۔ یہاں انھیں فوجی کی حیثیت سے بھرتی کر لیا گیا اور نصیر آباد چھاونی (اجمیر شریف) میں ٹریننگ کے لیے بھیجا گیا۔ یہاں فوجی تربیت دینے والے افسران ان کی فرض شناسی سے بہت خوش تھے۔ عبدالحمید خواجہ معین الدین چشتی کے پکے عقیدت مند تھے، انھیں جب بھی موقع ملتا تو وہ نصیر آباد سے غریب نواز کے دربار میں حاضری دینے چلے آتے تھے۔

عبدالحمید کو ہندوستانی فوج میں ابتداء 'گرینیڈیئر انفینٹری رجیمنٹ' میں شامل کیا گیا۔ فوج میں آپ نایک، حوالدار اور کمپنی کمانڈر جیسے عہدوں پر تعینات رہے۔ عبدالحمید جب جموں کشمیر بارڈر پر تعینات تھے تب انھوں نے ایک خطرناک ڈاکو عنایت علی کو گرفتار کروایا تو ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے انھیں 'لانس نایک' بنا دیا گیا۔ جب 1962 میں چین نے ہندوستان پر حملہ کیا تب عبدالحمید نیفا میں تعینات تھے۔ انھیں اس بات کا بہت افسوس تھا کہ انھیں میدان جنگ میں اپنے جوہر دکھانے کا موقع نہیں ملا لیکن 1965 میں جب

پاکستان نے ہندوستان پر حملہ کیا تو ان دنوں عبدالحمید پنجاب کی سرحد پر تعینات تھے، یہاں انھیں اپنی بہادری اور دلیری کے جوہر دکھانے اور مادر وطن کا قرض چکانے کا موقع مل گیا۔

عبدالحمید اس مرتبہ بہت خوش تھے۔ انھوں نے اپنے چچیرے بھائی نورحسن (جھنّن) سے جنگ کے مورچے پر جانے سے پہلے کہا کہ ''پلٹن میں ان کی بہت عزت ہوتی ہے جن کے پاس کوئی چکر ہوتا ہے، دیکھنا جھنن ہم بھی جنگ میں لڑ کر کوئی نہ کوئی چکر ضرور لے کر لوٹیں گے'' عبدالحمید کی یہ پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی کیونکہ آگے چل کر عبدالحمید کو 'پرم ویر چکر' کے علاوہ ان کی نمائندہ فوجی خدمات کے لیے سینیہ سیوا میڈل سمر سیوا میڈل، رکشا سیوا مڈل اور مہاویر چکر جیسے اعزازات سے نوازا گیا۔

30 ستمبر 1965 کو پاکستان نے ہندوستان پر اچانک حملہ کیا تو ہندوستانی فوج نے بھی پاکستان کو جواب دینے کے لیے کمر کس لی۔ عبدالحمید نے سب سے پہلے ہندوستانی فوج کے لیے خطرہ بنے 'چُوپل' کو اپنی زبردست نشانے بازی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی آر سی ایل گن سے اڑا دیا۔ بعد ازاں 9 ستمبر 1965 کو ہندوستانی فوج کو 'کھیم کرن سیکٹر' میں پہنچنے کا حکم دیا گیا۔ فوجی سولہ گھنٹوں کا سفر کر کے تھکے ہوئے تھے۔ اسی دوران اچانک تقریباً صبح نو بجے پاکستانی پیٹن ٹینکوں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ عبدالحمید نے نازک حالات کے پیش نظر اپنی دانش مندی اور چابک دستی کا ثبوت دیا۔ ان کے پاس ایک جیپ تھی جس پر توپ لگی ہوئی تھی۔ انھوں نے پاکستانی فوج کی نظر سے بچ کر اپنی جیپ کو ایک ٹیلے کی آڑ (اوٹ) میں لے لیا اور نشانہ لگا کر یکے بعد دیگرے پاکستان کے تین پیٹن ٹینکوں کے پرخچے اڑا دیے۔ اسی بیچ پاکستانی کمانڈر نے انھیں نشانہ لگاتے دیکھ لیا تو پاکستانی فوج نے انھیں گھیر کر گولیوں کی بارش شروع کر دی۔ پاکستانی پیٹن ٹینک کا ایک گولہ عبدالحمید کے بائیں ہاتھ کو ہوا میں لے آڑا۔ عبدالحمید نے اس پر بھی ہمت نہیں ہاری، وہ آخر دم تک اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ ان کی سانس ٹوٹتے وقت ان کا آخری جملہ یہ تھا 'ساتھیو آگے بڑھو' اور عبدالحمید نے 32 برس کی عمر میں اس طرح جام شہادت نوش فرمایا۔ ہندوستانی فوج آگے بڑھتی رہی اور پاکستانی فوج منہ کی کھا کر پیچھے ہٹتی رہی اور آخر کار پاکستانی فوج کو ہتھیار ڈال کر گھٹنے ٹیکنے پڑے۔

غازی پور کے مجسٹریٹ جب عبدالحمید کی شہادت کی خبر لے کر ان کے والد محمد عثمان کے پاس پہنچے تو بقول سید احسان علی ان کے والد نے ''دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہا ''ہمیں فخر ہے اپنے بیٹے پر کہ وہ جنگ میں پیٹھ دکھا کر نہیں بھاگے، ایسا کام کر کے شہید ہوئے ہیں کہ دنیا سیکڑوں سال یاد رکھے گی۔''

عبدالحمید کی شہادت کو سلام کرتے ہوئے حکومت ہند نے انھیں 'پرم ویر چکر' سے نوازا۔ یہ اعزاز ان کی اہلیہ رسولن بی بی نے صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کے ہاتھوں 26 جنوری کو حاصل کیا۔

شہید عبدالحمید کی یاد کو تازہ رکھتے ہوئے ان کے گاؤں کا نام 'عبدالحمید دھام' رکھا گیا۔ اس کے علاوہ ان کے گاؤں کے ایک اسکول، ایک لائبریری اور ایک ڈس پینسری کا نام بھی عبدالحمید سے منسوب ہے۔ 28 جنوری 2000 کو محکمہ ڈاک نے ان پر تین روپیہ کا ایک ڈاک ٹکٹ جاری کیا۔ کھیم کرن (پنجاب) میں، جہاں عبدالحمید نے شہادت پائی تھی، وہاں ان کا مقبرہ تعمیر کرایا گیا۔ یہاں ان کے یوم شہادت پر ہر سال میلہ لگتا ہے اور انھیں اہل ہندوستان خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

■

Dr. Moinuddin 'Shaheen'
395-A, Azad Nagar Kotra
Pushkar Road
Ajmer- 305001 (Rajasthan)

پیڑ ہمارے سچے دوست

رضاء الرحمن عاکف سنبھلی

رضاء الرحمن عاکف اردو کے معروف قلمکار، تبصرہ نگار اور بہت سی کتابوں کے مصنف ھیں۔ انھوں نے بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے بھی بہت سی کتابیں لکھی ھیں۔ شگوفے، غنچے، مہکتی کلیاں ان کے شعری مجموعے ھیں جن میں بچوں کے لیے بہت ھی پیاری پیاری نظمیں ھیں۔ بچوں کے لیے سبق آموز اصلاحی کہانیاں بھی لکھی ھیں۔ پھولوں کی ڈالی، نیك دل شہزادہ بچوں کے لیے لکھی کہانیوں کے مجموعے ھیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ابتدائی درجات کے لیے کئی کتابیں لکھی ھیں جن میں جہان اردو، ھماری دینیات (برائے درجات: ایل کے جی تا پنجم) اور آفتابِ اردو (برائے درجات: ششم ھفتم ھشتم) وغیرہ کا ذکر کیا جاسکتا ھے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو پیدا کیا۔ آسمان بنا کر اس کو تاروں سے سجایا، زمین ہموار کی اور پھر اس میں ندیاں بہائیں۔ بلند و بالا پہاڑ بنائے۔ مختلف قسم کے جاندار پیدا کیے۔ ان میں چرند و پرند اور بڑے بڑے حیوانات سے لے کر چھوٹے موٹے کیڑے مکوڑے بھی ہیں۔ الگ الگ طرح کے پیڑ پودے بھی پیدا کیے۔ ان میں کچھ کو پھل، پھول اور میوہ جات سے مالا مال کیے۔ یہ سب اس گلشنِ رنگ و بو کی زینت ہونے کے ساتھ ہی ہمارے لیے نہایت کارآمد اور فائدہ مند بھی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ وہ عظیم الشان مخلوق ہے جس کو انسانوں کے لیے بہت زیادہ مفید ہونے کے ساتھ ہی انسانوں کی زندگی کا لازمی حصہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان کے ذریعے وہ صحت و تندرستی کے ساتھ ہی طاقت و توانائی بھی حاصل کرتا ہے اور بہت سی ایسی چیزیں بھی انھیں سے لیتا ہے جو اس کی زندگی کے لیے لازمی حصہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں پانی و ہوا اور سورج کی روشنی کے ساتھ ہی یہ پیڑ پودے بھی ہیں۔ جن کے ذریعے انسان ضروریات زندگی کی دیگر چیزوں کے ساتھ ہی زندہ رہنے کے لیے بنیادی چیز آکسیجن (Oxegen) جیسی نعمت بھی حاصل کرتا ہے۔ پیڑوں کی اسی افادیت کے مدنظر آج ہم بچوں کو کچھ ایسی

باتیں بتانے جا رہے ہیں جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی دیگر مخلوق کے ساتھ ہی پیڑوں کے تعلق سے معلومات حاصل ہوگی۔

پیارے بچو! جب ہم اللہ تعالیٰ کی مخلوقات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے اندر بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کے ذریعے انسان نہ صرف وقتی فائدہ ہی حاصل کرتا ہے بلکہ اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو اس کی زندگی کا دارومدار بھی انہی پر ہوتا ہے۔ ان میں بہت سے حیوانات، چرند و پرند اور حشرات الارض کے ساتھ ہی دیگر اور مخلوقات بھی ہو سکتی ہیں۔ جو جاندار مخلوق کے ساتھ ہی شجر و حجر اور نباتات و جمادات بھی ہیں۔ ان میں بہت سی چیزیں انسان کے لیے بار برداری کے کام آتی ہیں۔ کچھ کو وہ غذا کے طور پر استعمال کرتا ہے تو کچھ اس کے کسی اور طرح سے استعمال میں آتی ہیں۔ گائے، بھینس، اونٹ، ہاتھی اور گھوڑے و بکری سے لے کر کبوتر مرغی اور شہد کی مکھی تک کو اس ضمن میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان میں بھی شہد کی مکھی تو ایسی مخلوق ہے جو بظاہر جسامت میں کمزور ہونے کے ساتھ ہی ہمارے لیے کس قدر مفید ہے کہ ہم اس سے شہد جیسی نعمت حاصل کرتے ہیں۔ جو ہماری صحت و زندگی کے لیے بہت ہی فائدہ مند ہے۔ اسی طرح پیڑ پودے بھی ہمارے لیے بہت زیادہ فائدہ مند ہیں کہ ان سے ہم پھول، پھل، مصالحے اور میوے حاصل کرتے ہیں۔ عمارت بنانے کے لیے لکڑی کام میں لاتے ہیں۔ تپتی دھوپ میں سایہ اور ہوا جیسی نعمت بھی تو ہم پیڑوں سے ہی حاصل کیا کرتے ہیں۔ انہی پیڑوں پر بہت سے پرندے اپنے آشیانے بنا کر بسیرا کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے بھی انہی پیڑوں سے زندگی حاصل کرتے ہیں جو کسی نہ کسی طور پر ہمارے لیے فائدہ مند ہوا کرتے ہیں۔ پرندوں کی تو زندگی کا دارومدار ہی پیڑ پودے ہیں کہ وہ انہی پر اپنا نشیمن بناتے ہیں۔ ان کی ڈالیوں پر چہل قدمی کرتے ہیں۔ جھولا جھولتے ہیں۔ موج مستی کرتے ہیں اور اپنا دل بہلاتے ہیں۔ غرض یہ کہ پیڑوں سے ہی ان کا تحفظ اور پیڑوں سے ہی ان کی زندگی ہے۔

ان سب چیزوں کے ساتھ ہی پیڑوں سے ہمیں ایک ایسی چیز بھی حاصل ہوا کرتی ہے جس پر ہماری زندگی کا دار ومدار ہے کہ اس کے ذریعے ہی ہم سانس لیتے ہیں اور زندگی

حاصل کرتے ہیں۔ کیونکہ پیڑوں سے ہم کو آکسیجن جیسی نعمت حاصل ہوتی ہے۔ ہے نہ حیرت کی بات کہ ہمارے جسم سے خارج ہونے والی گندی گیس کاربن ڈائی آکسائڈ کو یہی ہمارے خدائی خدمت گار اپنے اندر سمو لیتے ہیں اور پھر اسے صاف کر کے آکسیجن کی شکل میں ہمیں واپس کر دیتے ہیں۔ اس طرح یہ پیڑ پودے ہمارے جینے کا سامان مہیا کرتے ہیں اور بہ ظاہر یہ غیر معمولی سی مخلوق ہماری زندگی کی بنیاد ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہے اور اس سے پیڑوں کی اہمیت بھی ثابت ہوتی ہے؟

حیرت و تعجب اس بات پر ہے کہ وہی پیڑ جو انسان کے لیے اس قدر اہم اور فائدہ مند ہیں۔ کس قدر بے دردی و بے رحمی کے ساتھ وہ ان کو کاٹ رہا ہے۔ اور شہر میں رہائشی جگہ کی قلت اور گاؤں، دیہات و قصبات میں کاشت کاری کے لیے زمین کی کمی کا بہانا بنا کر ہم لوگ بڑی تعداد میں پیڑوں کو کاٹتے جا رہے ہیں۔ افسوس کی بات تو یہ ہے جو پیڑ کاٹے جا رہے ہیں، ان کے مقام پر نئی پود بھی نہیں لگائی جا رہی۔ جس کی وجہ سے بڑے پیمانے پر پیڑوں کا صفایا کیے جانے کی وجہ سے ڈر یہ ہے کہ کہیں ہماری زمین پیڑوں سے پوری طرح محروم نہ ہو جائے آج کی حالت تو یہ ہے کہ جہاں کبھی بڑی تعداد میں گھنے جنگل تھے۔ وہیں اب صاف اور چٹیل میدان نظر آ رہے ہیں اور وہی پیڑ جو ہمارے لیے فائدہ مند ہونے کے ساتھ ہی موسم میں اعتدال رکھنے اور بارش کے لیے مان سون بنانے میں اپنا کردار ادا کیا کرتے ہیں۔ بڑے پیمانے پر ان کے ختم ہو جانے کی وجہ سے بارش کم ہونے کی شکایت اور موسموں کے بگڑ جانے کا بھی زبردست خطرہ لاحق ہو چکا ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان پیڑوں کو کاٹ کر انسان اپنا کتنا بڑا نقصان کر رہا ہے اور اپنی تباہی و بربادی کا سامان مہیا کرتا جا رہا ہے۔

یہ بات بھی باعث تشویش ہے کہ جہاں بھی پیڑوں کو کاٹا گیا ہے۔ وہاں پر ان کے نعم البدل کے طور پر کوئی مناسب بند و بست نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس لیے ڈر یہ ہے کہ اگر آئندہ پھر پیڑوں کے کاٹے جانے کا یہ بے رحمانہ سلسلہ جاری رہا تو دیگر نقصانات کے ساتھ ہی ہماری دنیا کے ایک اہم اور خوبصورت مخلوق پرندوں سے بھی ہماری زندگی محروم ہو سکتی ہے کہ ان پرندوں کا وجود بھی تو پیڑوں کی وجہ سے ہی ہے کہ وہ بیچارے پیڑوں پر ہی رہتے ہیں۔ وہی ان کے دل بہلانے اور زندگی کا سبب ہیں کہ وہی ان کے آشیانے اور پناگاہیں ہیں۔ غور کرنے کی بات یہ بھی ہے کہ پیڑوں کے ختم ہونے کی وجہ سے محروم ہونے والی نعمتوں کو انسان اور کن ذرائع سے حاصل کرے گا اور اس نقصان کی بھرپائی وہ کس طرح کر پائے گا۔ یہی کچھ سوالات ہیں۔ جنھوں نے ہر اس شخص کو تشویش میں ڈال رکھا ہے جو اس کائنات اور اس کی ہر ایک چیز سے پیار کرتا ہے۔ راقم الحروف بھی کائنات کی ہر ہر چیز سے پیار محبت اور ہمدردی کے جذبات رکھتا ہے۔ اس لیے ان کے تحفظ اور بقا و سلامتی کا خواہش مند ہے۔ اس لیے ضروری سمجھتا ہے کہ مخلوقِ خدا کے لیے اپنے دلوں میں پیار کا جذبہ رکھنے والوں کو چاہیے کہ عملی میدان میں آگے آئیں اور اپنے و اپنی آنے والی نسلوں کے مفاد میں کچھ سوچیں غور و فکر کریں اور عملی قدم اٹھاتے ہوئے قدرت کے عظیم ذخائر پانی، بجلی اور پیڑوں کے تحفظ کا بیڑا اٹھائیں اور انہیں تباہ و برباد ہونے سے بچائیں تاکہ یہ عمل ہماری زندگی کی بقا و سلامتی کے لیے بہتر ثابت ہو۔

■

Dr. Razaur Rahman Akif Sambhali
Miyan Sarai, Katra Bazar
Sambhal - (UP)
Mob.: 98378268 09

انور ادیب

جنگلی جانوروں کا تحفظ

بچو! تم نے جنگلی جانوروں کے مشہور شکاری جم کاربٹ کا نام سنا ہوگا۔ ان کی زندگی کی کہانی بے حد دلچسپ ہے۔ آؤ میں تمھیں ان کے بارے میں کچھ بتاؤں۔ جم کاربٹ کا پورا نام جیمس ایڈورڈ کاربٹ تھا۔ لیکن وہ جم کاربٹ کے نام سے مشہور تھے۔ آدم خور شیروں کے شکار کے لیے انھیں کافی شہرت حاصل ہوئی تھی۔

جم کاربٹ کی پیدائش 25 جولائی 1875 میں نینی تال میں ہوئی تھی۔ تم تو جانتے ہو کہ نینی تال ایک خوبصورت، صحت بخش مقام ہے۔ جم کاربٹ کے والد یہاں پوسٹ ماسٹر تھے۔ ان کا نام کرسٹوفر کاربٹ اور والدہ کا نام میری کاربٹ تھا۔ جم کاربٹ اپنے والدین کی آٹھویں اولاد تھے۔ کاربٹ خاندان کے لوگ برسوں سے ہندوستان میں رہ رہے تھے۔

کاربٹ خاندان خوشحال نہیں تھا لیکن جم کا بچپن خوشگوار تھا۔ ان کی تعلیم یہیں ہوئی، انھیں پڑھائی لکھائی سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی پھر بھی انھوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ وہ اپنی خوش اخلاقی کی وجہ سے اپنے ساتھیوں اور استادوں میں کافی مقبول تھے۔

جم کو جنگل کا قدرتی ماحول بے حد پسند تھا۔ ان کے گھر کے چاروں طرف جنگل تھا۔ نینی تال کا سارا علاقہ ان دنوں جنگلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس لیے آبادی بہت کم تھی۔ جنگلی جانوروں کی کثرت تھی۔ یہ علاقہ شیروں، چیتوں اور بھالوؤں کے شکار کا گڑھ تھا۔ جم جنگل کے اس فطری ماحول میں جنگل کے جانوروں اور پرندوں کی عادتوں کا بغور مطالعہ کرتا تھا۔ بچپن میں وہ مقامی شکاریوں کے ساتھ اور کبھی کبھی تنہا جنگلوں میں گھوما کرتا تھا۔ بندوق چلانا اس نے اپنے بڑے بھائی ٹام سے سیکھا تھا۔

جم جب 5 سال کا تھا تو بندوق چلانا سیکھنے کے لیے اسے اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ 10 سال کی عمر میں اس نے

بندوق چلانے میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ اسے نینی تال کے رائفل کلب میں داخل کر دیا گیا۔

1893 میں جم بنگال ریلوے میں 100 روپے ماہانہ تنخواہ پر ملازم ہوگئے اور یہاں کے مقامی گھاٹ میں رہنے لگے۔ وہ20 سال تک ملازمت میں رہے۔ یہ مدت پریشانیوں میں گزری۔ مالی پریشانیوں کی وجہ سے انھوں نے شادی نہیں کی۔ ان کے گھر میں ان کی غیر شادی شدہ بہن میگی کے علاوہ بہت سے پالتو جانور تھے۔

1907 میں جم چھٹیوں میں نینی تال آئے۔ اس وقت ان کی عمر 33 سال تھی۔ اس وقت انھیں نینی تال کلکٹر کی طرف سے ایک آدم خور شیر کو مارنے کی دعوت ملی۔ یہ آدم خور شیر جس کا نام چمپادت تھا، اس وقت تک 200 لوگوں کی جان لے چکا تھا۔ جم نے یہ دعوت قبول کر لی اور سخت تگ و دو کے بعد اسے مار ڈالا۔ 1938 میں 63 سال کی عمر میں انھوں نے ایک آدم خور کو مارا۔ یہ ان کی زندگی کا آخری شکار تھا۔

جم کو جانوروں اور پرندوں سے بے حد پیار تھا۔ لہٰذا ایک بار جب دو تین فوجی افسروں نے بہت سی مرغابیوں کو مار گرایا تو اسے دیکھ کر جم کو شکار سے نفرت ہوگئی۔ وہ بے چین ہوگئے۔ انھوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ شوقیہ شکار نہیں کریں گے۔ ہاں لوگوں کو خطرناک جانوروں سے بچانے کے لیے شکار کریں گے۔ اور اس عہد کو انھوں نے آخری وقت تک نبھایا اور اس ضمن میں وہ لوگوں کے مسیحا تھے۔

ان کا کہنا تھا کہ جنگل کا کوئی جانور اپنے فطری ماحول میں خطرناک نہیں ہوا کرتا بلکہ کسی غیر معمولی حالات میں وہ انسان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ایسے جانوروں کو ہلاک کرنا جم اپنا فرض سمجھتے تھے۔

انھوں نے گڑھوال اور کمایوں کے لاکھوں لوگوں کو ایسے جانوروں سے نجات دلائی۔ ان دنوں کمایوں اور گڑھوال کے گاؤں میں آدم خوروں کی وجہ سے زبردست دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ ان علاقوں میں آدم خوروں نے سیکڑوں لوگوں کی جانیں لی تھیں۔ جم نے اپنی محنت اور مہارت سے ان جانوروں کو ہلاک کیا۔ انھوں نے آدم خوروں کو ان کی پناہ گاہوں میں گھس کر ہلاک کیا۔ یہ زبردست ہمت کی بات تھی۔ شدید گرمی میں گھاس کے میدان میں بھیانک جنگلوں اور دشوار گھاٹیوں میں ایسے آدم خوروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلاک کرنا نہایت ہمت اور جوانمردی کی بات تھی۔

ایک وقت ایسا آیا جب کمایوں اور گڑھوال وغیرہ کے آدم خوروں کا صفایا ہو گیا تو انھوں نے جانوروں کا شکار بند کر دیا۔ ویسے بھی جنگلی جانوروں کا شوقیہ شکار کرنا انھیں پسند نہیں تھا۔ انہیں جنگلی جانوروں کے تحفظ کا بے حد خیال تھا۔ وہ جانوروں کے سچے ہمدرد تھے۔ ان کے اس جذبے کی قدر سبھی کرتے تھے۔ اتر پردیش کے گورنر سر مالکم ہیلی ان کے اس جذبے سے بے حد متاثر تھے۔ وہ جم کو ہر طرح تعاون دیتے تھے۔

جنگلی جانوروں کو تحفظ دینے کے لیے قومی پارک بنانے کی خاطر 1935 میں حکومت نے ایک ایکٹ پاس کیا جو یوپی نیشنل پارک ایکٹ کے نام سے مشہور ہے۔ اسی سال رام نگر کے قریب سر مالکم ہیلی کے نام پر پہلا نیشنل پارک قائم کیا گیا۔ اس پارک کے قیام میں جم کا بڑا ہاتھ تھا۔ بعد میں اس پارک کا نام رام گنگا نیشنل پارک رکھا گیا۔ اس کے بعد جنگلی جانوروں کے تحفظ کے سلسلے میں جم کی خدمات کے پیش نظر اس پارک کا نام جم کاربٹ پارک کر دیا گیا۔

جم نے آدم خور شیروں کے شکار پر بہت سی کتابیں لکھیں، جو بے حد مشہور ہوئیں۔ ان کی آخری کتاب Tree Tops ہے جس میں انہوں نے افریقی وائلڈ لائف کے متعلق اپنے تجربات بیان کیے ہیں۔ ان کی بہت سی کتابوں کا دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

جم نے جنگل کی زندگی کو فلمانے کی کوشش بھی کی تھی۔ وہ جنگلی جانوروں کی فلموں کو محفوظ کرنا چاہتے تھے۔ ان فلموں کے بہت کم حصے باقی بچے ہیں۔

ان کی کتابوں میں Man Eaters of Kumaon سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ یہ کتاب 1945 میں شائع ہوئی اور مختصر مدت میں اس کا 20 زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ Jangle Love ان کی دوسری سب سے مقبول کتاب ہے۔ اس میں انھوں نے جنگل اور شیروں کے متعلق قیمتی معلومات جمع کی ہیں۔

جم کو یہاں کے لوگوں سے بے حد پیار تھا اور لوگ بھی ان سے بہت محبت کرتے تھے اور انھیں 'گورا سادھو' کہتے تھے۔ انھیں غریبوں سے بے حد ہمدردی تھی۔ انھوں نے اپنی کتاب My India کو یہاں کے عوام کے نام سے منسوب کیا تھا۔ وہ اپنی کتابوں کی آمدنی کا بڑا حصہ غریبوں پر خرچ کرتے تھے۔

ستمبر 1946 میں جم اپنی بہن میگی کے ساتھ کینیا (افریقہ) چلے گئے۔ اس وقت ان کی عمر 71 سال تھی۔ انھیں نینی تال سے بے حد محبت تھی۔ وہ نینی تال آنا چاہتے تھے لیکن انھیں ہندوستان آنا نصیب نہیں ہوا۔ 80 سال کی عمر میں 19 اپریل 1955 میں وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔

■

Dr. Anwar Adeeb
Ibrahim Manzil
Mosaddi Mohalla, Railpar
P.O: Asansol- 713301
Distt.: Paschim Bardhaman (West Bengal)

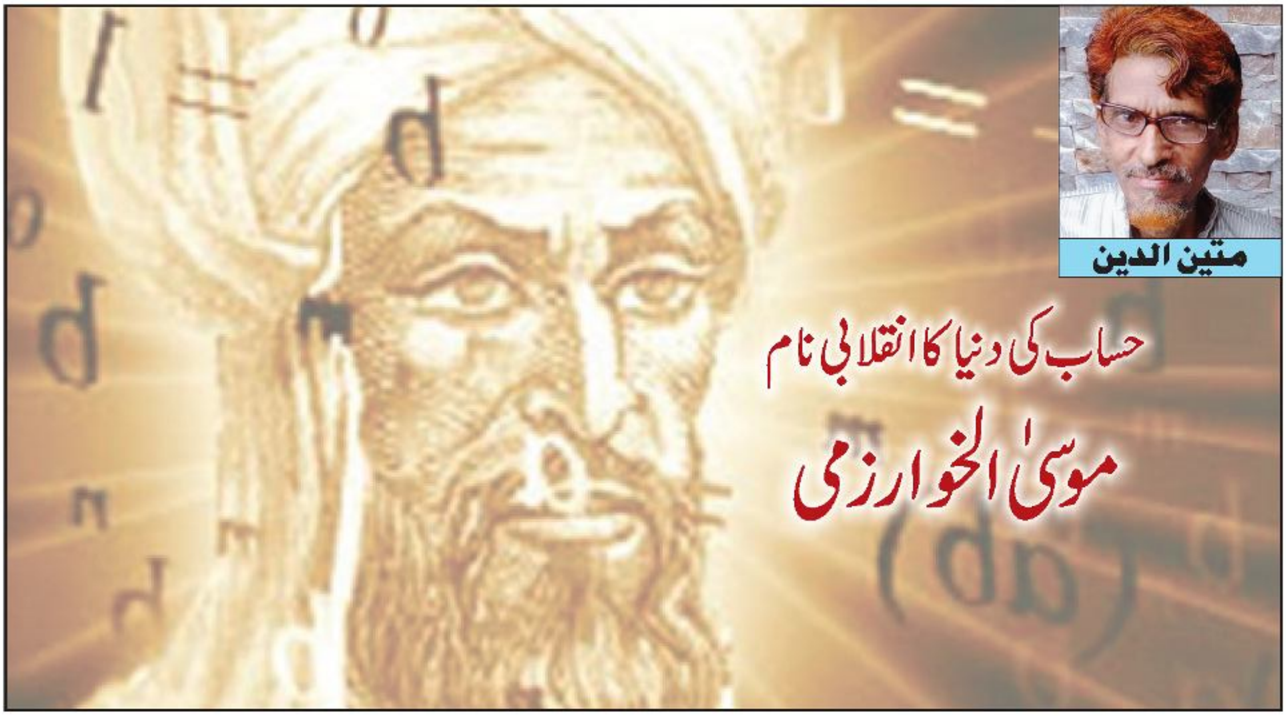

متین الدین

حساب کی دنیا کا انقلابی نام

موسیٰ الخوارزمی

محمد بن عبداللہ موسیٰ الخوارزمی حساب کی دنیا کا مشہور نام ہے۔خوارزمی کو الجبرا کا باوا آدم قرار دیا جاسکتا ہے۔تاریخ انسانیت میں ان کی شہرت علم الحساب میں ہندی اعداد وشمار میں صفر کے استعمال کی وجہ سے ہے۔ خوارزمی کا بڑا کارنامہ ان کی اپنی کتاب 'علم الجبر والمقابلہ' ہے جوتقریباً 830 عیسوی میں تحریر ہوئی۔ابن خلدون نے کہا ہے کہ علم الجبر میں سب سے پہلے خوارزمی نے کتاب لکھی۔ خوارزمی نے علم الجبر کے متفرق مسائل کو یکجا کیا اور اس کو علمی حیثیت سے ترقی دی۔ اس فن کے پیچیدہ مسائل کو حل کیا۔ خوارزمی کی کتاب کے نام پر اس علم کا نام الجبرا پڑا اور تمام دنیا میں حساب کی یہ شاخ الجبرا کہلائی۔

الخوارزمی نے اپنی کتاب میں نا معلوم عدد کے لیے 'س' کا استعمال کیا جو آگے چل کر (X) بنا۔اس کتاب میں انھوں نے ضرب تقسیم جمع تفریق پیائش خرید و فروخت کرایہ نقدی ناپ تول وزن کے مسائل ہموار سطح دائرے مثلث شکلوں کی پیائش ترکہ اور میراث کے حصوں کی تقسیم کے مسائل کو حل کیا اور ان تمام معاملات میں علم جبر کا استعمال کیا۔

الخوارزمی نے 825 عیسوی میں ہندی اعداد پر 'حساب الہندی' کتاب لکھی جس کے بعد پورے مشرق وسطیٰ اور یورپ میں اس عددی نظام کا رواج شروع ہوگیا۔لاطینی میں اعداد کا لکھنا بہت مشکل تھا جیسے 34 کے لیے (xxxiv) مگر ہندی نظام اعداد میں ہزاروں لاکھوں کروڑوں کو اعداد میں لکھنا بہت آسان تھا۔آج یہی اعداد کمپیوٹر کے نظام میں ریڑھ کی ہڈی ہیں تمام کمپیوٹر 0&1 پر کام کرتے ہیں یعنی کوئی چیز یا تو آن ہے یا پھر آف۔

لاطینی میں اس کتاب کا ترجمہ Algoritmi do Numro Indorum کے عنوان سے کیا گیا جس سے الگورتھم کی اصطلاح وجود میں آئی ہے جو خوارزمی کے نام کے ساتھ مشتق ہے۔ ہندی اعداد سے حساب کرنے کی تکنیک کا نام الگورتھم ہے۔الگورتھم کا مطلب ہے ایسی سائنس جس میں نو ہندسوں اور ایک صفر سے حساب نکالا جاسکے۔کمپیوٹر کی بنیاد ہی الگورتھم ہے۔ اس کے بغیر کوئی کمپیوٹر کام نہیں کرسکتا۔

حساب اور کمپیوٹر میں یہ طریقہ اساسی اہمیت رکھتا ہے۔ کسی بھی مسئلے کو ہم اگر ایک بار الگورتھم سے ترتیب دیں تو اس کو کسی بھی کتاب کمپیوٹر اور پروگرامنگ زبان میں استعمال کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر ہمارے پاس 10,000 ٹیلی فون نمبر ہیں تو فقط ایک منٹ میں ہمیں اپنا مطلوبہ ٹیلی فون نمبر 5540380 تلاش کرنا ہے جب کہ اس دوران نمبروں میں اضافہ ہو رہا ہے تو اس شکل کو الگورتھم سے حل کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ بالواسطہ کمپیوٹر کی ایجاد میں مسلم سائنسداں الخوارزمی کا بھی حصہ ہے۔

خلیفہ مامون کے دور حکومت میں ہندی اعداد کا رواج شروع ہوا تھا۔ خوارزمی کی کتابوں کے لاطینی میں ترجمہ کے بعد عربی اعداد یورپ پہنچ گئے۔ یوں یورپ کے حلقوں اور تجارتی دنیا میں حساب کتاب کے طریقوں میں عربی اعداد کے استعمال سے انقلاب آگیا۔ چونکہ ہندی اعداد سے دنیا اس کتاب سے متعارف ہوئی تھی اس لیے عرب اسے ہندسہ کہتے ہیں اور عرب اسلامی دنیا سے ہوتے ہوئے یورپ پہنچے تھے۔ اس لیے یورپ والے اسے Arabic numerals کہتے ہیں۔ عربی میں ہندسہ کے معنی ہندوستانی کے ہیں یعنی یہ طریقہ حساب عربوں نے ہندوستان سے سیکھا تھا، جسے خوارزمی نے آگے بڑھایا اور اپنی علمی صلاحیت کے ذریعے سے دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔

پیارے بچو! یہ تھی ایک حسابی دنیا کے انقلابی شخص موسیٰ الخوارزمی کی مختصر سی تاریخ جو سوال کر رہی ہے اپنے مستقبل کے ہونہاروں سے کہ تم اپنے کسی عمل سے دنیا کی ترقی کے حصے دار بننا چاہتے ہو؟

■

Matinuddin
Trp. Umri Kalan
Distt: Moradabad - 244501 (UP)
Mob.: 9690287383

Subscription Form "Bachon Ki Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں بچوں کی دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا / چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ / منی آرڈر.................... بتاریخ..............................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'بچوں کی دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

محمد بہلول

مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت

انسانی سماج میں ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے وہی زبان ہوتی ہے جسے وہ اپنی ماں کی گود سے سمجھنے اور بولنے لگتا ہے۔ مختلف علاقوں، ملکوں اور ریاستوں نے اپنی زبان کو ایجاد کیا اسے مادری زبان کہا جاتا ہے۔

مادری زبان کی اہمیت اتنی ہی ہے جتنی جسم کے لیے روح کی ہے، انسانی جسم میں جب بھی کوئی تکلیف ہو فوراً اس کا احساس ہوتا ہے اور سمجھ میں آتا ہے کہ پریشانی کیا ہے جس کے حل کی تلاش میں انسان یک جٹ ہو جاتا ہے، ٹھیک اسی طرح انسانی زندگی میں مادری زبان کی بھی اہمیت اور معنویت ہے۔ علم کے حصول میں جو آسانیاں مادری زبان کے ذریعے ہوتی ہیں وہ دوسری زبان میں زیادہ مشکل ہوتی ہیں۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ ماں اپنے بچے کی پریشانی اور تکلیف کو جتنی آسانی سے سمجھ پاتی ہے، وہ شاید دنیا کے ماہر نفسیات بھی نہیں سمجھ سکتے، بالکل ٹھیک اسی طرح بچہ بھی اپنی مادری زبان میں بہتر تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔

ہم جس ملک میں رہتے ہیں یہاں مختلف قوم و مذہب کے لوگ رہتے ہیں۔ چاہے کسی بھی مذہب سے تعلق کیوں نہ رکھتے ہوں تقریباً سبھی کی اپنی علاقائی زبانیں ہیں، بلکہ کچھ زبانیں تو ایسی ہیں جو کہ مکمل طور پر بولی پڑھی اور سمجھی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر سنسکرت، ہندی، اردو، پنجابی، گجراتی، ملیالم، کنڑ، تمل، سندھی، مراٹھی اور تلگو وغیرہ ایسی زبانیں ہیں جو تہذیبی اور ثقافتی معنویت کی حامل ہیں۔ تقریباً تمام اہل زبان کو اپنی مادری زبان میں ابتدائی سطح کی تعلیم دلانے میں حکومتی مراعات حاصل ہیں۔ زبان چاہے کوئی بھی کیوں نہ ہو، ہر ایک زبان تہذیبی، ادبی، ثقافتی اور سماجی و تمدنی اہمیت و معنویت کی حامل ہوتی ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان میں جتنی بھی زبانیں بولی، سمجھی اور پڑھی جاتی ہیں سبھی کی ایک علاحدہ شناخت ہے۔

مادری زبان میں تعلیم اس لیے بھی ضروری ہے کہ کسی بچے کا ذہن بہ حسن و خوبی اساتذہ کے ذریعے دی گئی ہدایات کو آسانی سے سمجھ لیتا ہے اور تمام موضوعات کو بغیر کسی گھٹن اور اکتاہٹ کے حل کرنے کے قابل بن جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بچے کی ذہانت کا اندازہ ہم کارٹون نیٹ ورک پروگرام سے

لگا سکتے ہیں۔ کارٹون پروگرام کے ذریعے بچہ جس آسانی سے کہانی کو سمجھ لیتا ہے شاید اتنی جلدی کوئی بڑا شخص بھی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ معمولی سی ٹیڑھی ترچھی تصاویر کے ذریعے بتائے گئے کہانی اور قصے میں بچے کتنی دلچسپی لیتے ہیں، ٹھیک اسی انداز میں اساتذہ طلبا وطالبات کو اپنی مادری زبان میں پڑھاتے ہیں تو وہ آسانی سے ساری چیزوں کو سمجھ سکتے ہیں۔

حال ہی میں ایک تجزیاتی مطالعے سے پتہ چلا ہے کہ جو بچے دیہی علاقوں میں رہتے ہیں اور اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، انھوں نے بہ نسبت ان بچوں کے زیادہ سبقت حاصل کی جنھوں نے دیہی علاقوں میں ہی رہ کر انگریزی میڈیم سے تعلیم حاصل کی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ شہری اور دیہی علاقوں کے تناسب سے شہری علاقوں میں تعلیم حاصل کرنے والے انگریزی میڈیم کے بچوں کو سبقت حاصل ہے۔

(تجزیہ نگار: پروفیسر تمّلا راما کرشنا، شعبہ تلگو، حیدرآباد یونیورسٹی، انڈین ایکسپریس انگریزی بتاریخ 24 فروری 2015)

لیکن دوسری جانب آج کے تیز رفتار دور میں انگریزی کا بول بالا ہے اور زیادہ تر تعلیم وتدریس کا میڈیم انگریزی زبان میں ہی ہے۔ اگر ہم اس پر غور کریں تو ایک سوال ذہن میں ضرور آتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ آج پوری دنیا میں انگریزی زبان ہر کس و ناکس کے دلوں پر راج کر رہی ہے اور اپنی چھاپ چھوڑے ہوئے ہے؟ دراصل اس کا جواب بھی یہی ہوگا کہ اہل انگریزی اپنی تمام تر کوشش اور محنت وہ چاہے زندگی کا کوئی بھی گوشہ کیوں نہ ہو وہ انگریزی میں ہی کرتے ہیں، چونکہ انگریزی زبان پوری عالمی سطح پر ایک کاروباری اور دفتری زبان بن گئی ہے، اس سے ہم روگردانی تو خیر نہیں کر سکتے ہیں لیکن کیا ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ ابتدائی وثانوی سطح تک کی تعلیم ہم اپنی مادری زبان میں حاصل کریں۔ اس طرح ہماری اپنی زبانیں زندہ وجاوید رہیں گی۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مادری زبان میں اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھانا آسان ہوتا ہے۔ اس کے برعکس دوسری زبانوں میں یہ کام نہ صرف مشکل ہوتا ہے بلکہ کبھی کبھی بہت سے بچوں کی صلاحیتیں، دوسری زبان کو اچھی طرح نہ سمجھ پانے کی وجہ سے دبی رہ جاتی ہیں کیونکہ دوسری زبانوں کو اس حد تک سمجھنے میں اچھا خاصا وقت لگ جاتا ہے کہ ان کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کو ادا کیا جاسکے یا ان زبانوں میں پیش کردہ تمام باتوں کو سمجھا جاسکے۔ جب تک دوسری زبانوں میں اس قدر مہارت حاصل ہوتی ہے، اس وقت تک زندگی کے کئی سال گزر جاتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی دوسری زبانوں کو ٹھیک طور پر سمجھنے کے لائق بننے میں بچہ نوجوانی کی عمر کو پہنچ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دوران وہ باتیں جو بچپن کی عمر میں سیکھی جاتی ہیں یا وہ صلاحیتیں جو 6 سال سے 12 سال کی عمر کے درمیان پروان چڑھتی ہیں، وہ دبی رہ جاتی ہیں اور زندگی کے کسی موڑ پر سامنے نہیں آتیں۔ اس لیے بچپن کی عمر میں لازمی طور پر تعلیم مادری زبان میں ہونی چاہیے۔ ہاں ایک مضمون کے طور پر دوسری زبانوں کو پڑھائے جانے کے سلسلے کو جاری رکھا جاسکتا ہے تاکہ اس دوران دوسری زبانوں سے بھی واقفیت ہوجائے۔ یہ ہمارے عہد کا بڑا المیہ ہے کہ لوگ اپنے بچوں کو بہت کم عمری سے یعنی پانچ چھ برس کی عمر سے انگلش میڈیم اسکولوں میں داخل کرادیتے ہیں جہاں سارے علوم انگریزی میں پڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ پورے طور پر ہر علم اور ہر بات کو بچے سمجھ سکیں۔ کچھ سالوں کے بعد نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کی انگریزی کچھ

بہتر ہو جاتی ہے لیکن ان مختلف علوم میں وہ کمزور رہ جاتے ہیں جو انھیں وہاں پڑھائے جاتے ہیں یا پڑھائے جانے چاہئیں۔ انگلش میڈیم اسکولوں میں شروع سے بچوں کو پڑھانے کا ایک نقصان یہ بھی سامنے آتا ہے کہ وہ اپنی تہذیب وثقافت سے آہستہ آہستہ کٹتے چلے جاتے ہیں اور انگریزی تہذیب ان پر اثرانداز ہوتی چلی جاتی ہے کیونکہ اس سچائی سے کوئی انکارنہیں کرسکتا کہ ہر زبان اپنے اندر ایک تہذیب اور کلچر رکھتی ہے۔ مادری زبان اپنا کلچر رکھتی ہے اور بیرونی زبان اپنی تہذیب و ثقافت رکھتی ہے۔ گویا کہ ہم چھوٹی عمر میں مادری زبان سے اپنے بچوں کو ہٹا کر اپنی تہذیب سے انھیں دور کررہے ہیں اور دوسری تہذیبوں کی طرف انھیں لے کر جارہے ہیں۔ اس تناظر میں یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مادری زبان میں تعلیم وتدریس کتنی اہم ہے۔

مادری زبان میں تعلیم وتدریس کی اہمیت کا اندازہ مشہور ومعروف شاعر و ادیب آنند نرائن ملا کے اس قول سے کیا جا سکتا ہے:

"اردو میری مادری زبان ہے۔ میں مذہب
بدل سکتا ہوں، مادری زبان نہیں۔"

مادری زبان کو فروغ دینے میں ہمارا اولین لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے، اس تعلق سے یونیسکو کے اس بیان کو ضرور دیکھنا چاہیے جس کا مفہوم کچھ یوں ہے:

"خاندان کے افراد بچوں کے پہلے استاد کی حیثیت سے اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ فارمل اور نان فارمل تعلیم اور مادری زبان کے استعمال میں خاندان کا کیا رول ہے، اس پر بھی تحقیق ہونی چاہیے۔"

ہماری حکومت کی اس جانب خاص توجہ مرکوز ہے کہ تمام اہل زبان کو انھیں اپنی مادری زبان میں کم از کم ابتدائی سطح تک کی تعلیم لازمی طور پر دلوائی جائے تا کہ بچوں کو اپنی زبان اور رسم الخط کی جانکاری اور واقفیت حاصل ہو سکے، اس سے نہ صرف زبان کا تحفظ ہوگا بلکہ ہندوستانی تہذیب وثقافت کی عالمی شناخت میں چار چاند لگ سکتے ہیں۔

■

Dr. Mohd Bahlul
492 First Floor, Gali Bahar Wali,
Chatta Lal Miyan, Daryaganj,
New Delhi 110002
Mobile No. 8527527726

چلوتم ادھرکوہواہوجدھرکی

محمد اسداللہ

ڈاکٹر محمد اسداللہ انشائیہ نگار، مراٹھی زبان کے ترجمہ نگار اور بچوں کے ادیب کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے بہت سی نظمیں، کہانیاں اور مضامین لکھے ہیں۔ بچوں کے لیے ان کی کئی کتابیں منظرعام پر آچکی ہیں۔ جن میں صبح زرنگار، پرواز، خواب نگر، جانوروں کی اہمیت اور آزادی قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے بچوں کے مقبول ماہنامہ کھلونا' نئی دہلی کا ایک انتخاب بھی شائع کیا ہے۔ اس میں کھلونا میں شائع ہونے والی بہت قیمتی تحریریں شامل ہیں اور یہ انتخاب بچوں کے لیے نہایت مفید ہے۔

احمد : ارے بھائی پوسٹ مین! سنو کیا ہماری کوئی ڈاک آئی ہے؟

ڈاکیہ: نہیں صاحب، آج کچھ نہیں ہے۔

احمد :ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ میرے ایک دوست کا خط آنے والا تھا۔

ڈاکیہ: ہوتا تو کیا میں چھپا کر رکھ لیتا؟

احمد :اسے خط بھیجے ہوئے تو ایک ہفتہ ہوگیا۔

ڈاکیہ: یہ آپ کو کیسے پتہ چلا؟

احمد :اس نے مجھے فون پر بتایا۔

ڈاکیہ: پھراس نے خط لکھا ہی کیوں؟ ساری باتیں فون پر ہی بتا دیتا۔

احمد :کون سی بات؟

ڈاکیہ: وہی جواس نے خط میں لکھی ہے۔

احمد :فون پر ساری باتیں کیسے ہوں گی؟ اور فون کا بل بھی تو

آتا ہے؟

ڈاکیہ: خط پر بھی تو خرچ آتا ہے۔ ٹکٹ لگتے ہیں۔ فون، موبائیل، ایس ایم ایس۔ اسکین، فوٹو شاٹ، کوریئر، آن لائن پیمینٹ کی سہولت وغیرہ... سب کچھ آ گیا ہے، پھر بھی لوگ نہ جانے کس دنیا میں رہتے ہیں۔ ڈاک اور ڈاکیے کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔

احمد: تمھیں کیا پریشانی ہے؟

ڈاکیہ: لوگ پوسٹ سے لفافے اور پارسل بھیجتے رہتے ہیں۔ اتنے بڑے بڑے گٹھے لے لے کے گھومنا پڑتا ہے مجھے۔ لوگ آن لائن سرویس کیوں استعمال نہیں کرتے؟

احمد: ارے بھائی! سبھی لوگوں کو یہ نہیں جمتا، لوگوں کو پوسٹ آفس کی عادت ہے۔ انھیں بدلنے میں تھوڑا وقت لگے گا۔ پھر بھی بہت کچھ بدل رہا ہے۔ اس کے علاوہ خط کے اندر صرف باتیں ہی نہیں ہوتیں۔ کچھ ضروری کاغذات، اوریجنل ڈاکیومینٹس اور دوسری چیزیں بھی ہوتیں ہیں جو فون سے نہیں بھیجی جاسکتیں۔ کتابوں کے پارسل ہوتے ہیں۔

ڈاکیہ: صاحب! اب آن لائن سرویس اور کوریئر سے سب کچھ بھیجا جاسکتا ہے۔

احمد: یہ بتاؤ، ڈاک پہنچانا تمھیں اتنا جان پر کیوں آتا ہے۔ تمھیں تنخواہ تو اسی کی ملتی ہے نا؟

ڈاکیہ: تنخواہ تو ملتی ہے مگر کام اتنا زیادہ ہے؟

احمد: کام زیادہ کہاں ہے؟ زیادہ تر لوگ تو اب خط بھی نہیں لکھتے، فون پر ہی بات کر لیتے ہیں۔ کوریئر سروس کا استعمال کرتے ہیں۔

ڈاکیہ: اسی لیے تو ہمارے محکمے نے ملازم کم کر دیے ہیں، جن لوگوں نے ریٹائرمنٹ لیا ہے یا چھٹی پر رہتے ہیں ان کا کام بھی ہمارے سر پر ڈال دیا جاتا ہے۔ اب دیکھو یہ واگھ مارے کی ڈاک بھی مجھے ہی بانٹنی پڑ رہی ہے۔ میں تو گھر گھر جا جا کر تنگ آ گیا ہوں۔

احمد: تمھیں شکر ادا کرنا چاہیے کہ تمھاری نوکری اسی سے ہے۔ ویسے بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب یہ ڈاک اور چٹھیاں وٹھیاں نہیں رہیں گی۔ تمھارے بچوں کو پوسٹ مین کی نوکری ڈھونڈنے سے نہ ملے گی۔

ڈاکیہ: صاحب! میں بہت پڑھا لکھا نہیں ہوں اسی لیے یہ ڈاک کے بنڈل اٹھا اٹھا کر در در کی خاک چھان رہا ہوں مگر اتنا میں بھی سمجھتا ہوں کہ جدھر کی ہوا ہو ادھر چلنا چاہیے۔

احمد: میں سمجھا نہیں۔

ڈاکیہ: میں نہیں چاہتا کہ میرے بچے کوئی چھوٹی موٹی نوکری کریں، اسی لیے میں نے اپنے بڑے بیٹے کو کمپیوٹر انجینئر بنایا ہے اور بیٹی بی یو ایم ایس کر رہی ہے۔

احمد: ارے واہ۔

ڈاکیہ: اب اگلے سال میرا بھی ایٹائرمنٹ ہے... اچھا اب چلتا ہوں۔

احمد: ارے میری ڈاک کا کیا؟

ڈاکیہ: ڈاک آئے گی تو میں ضرور لاؤں گا ساب، اچھا، نمستے۔

■

Mohd Asadullah
30, Gulsitan Colony
Near Panday Lance
Nagpur - 440013 (Maharashtra)

بیٹی بچاؤ بیٹی پڑھاؤ

نظم

کرشن کمار طور

کرشن کمار طور اردو کے بزرگ شاعر ہیں لاہور میں 1933میں پیدا ہوئے۔ بعد میں ہندوستان آگئے۔ انہیں اردو میں ساہتیہ اکادمی جیسا موقر ایوارڈ مل چکا ہے۔ ان کی بہت سی کتابیں منظرعام پر آچکی ہیں جن میں رفتۂ رمز، گفتۂ غالب، خاک خمیر، غرفۂ غیب، مشک منور وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ وہ دھرم شالہ ہماچل پردیش سے 'سرسبز' کے نام سے ایک رسالہ بھی شائع کرتے ہیں جو شاعری پر مشتمل ہوتا ہے اور یہ رسالہ علمی اور ادبی طبقے میں بہت مقبول بھی ہے۔ کرشن کمار طور جی بچوں کے لیے بھی لکھتے رہے ہیں۔

آؤ بیٹی بچائیں ہم سب
بیٹی باپ کی آنکھ کا تارا
کیا کہتے ہو کیسی بیٹی
بیٹی مستقبل کہلائے
رنگ جماتی ہے یہ بیٹی
بیٹی جب بھی پڑھے گی لوگو!
اس کا تو نرمل تن من ہے
سارے نقش ونگار ہیں اس سے
ہر پھلواری مہکے اس سے
گزرے لمحوں کی اک مورت
یہ موتی ہر دل چمکائے
یہ پرتیک نئی نسلوں کی
سب کی ایک سفارش جیسی
ریشم جیسی کھادی جیسی
رات میں دن کا حسن جڑے گی
غم میں آس بندھاتی ہے یہ
خوشیوں کے آنسو کی طرح ہے
پیار کی چادر اوڑھتی ہے یہ
کچھ مرضی سے کب ہوتا ہے

آؤ بیٹی پڑھائیں ہم سب
بیٹی ماں کے دل کا سہارا
چاند کی کرنوں جیسی بیٹی
بیٹی سب کی یاد دلائے
پھول کھلاتی ہے یہ بیٹی
دنیا آگے بڑھے گی لوگو!
اس سے سارا گھر روشن ہے
پھول ہیں اس سے خار ہیں اس سے
دل کی کیاری مہکے اس سے
آنے والے کل کی صورت
ہر انسان کو رشک آجائے
یہ بالی ہے سکھر فصلوں کی
یہ ہے پیار کی بارش جیسی
یہ کشمیر کی وادی جیسی
یہ جو پڑھی تو دنیا پڑھے گی
اچھے خواب دکھاتی ہے یہ
راتوں میں جگنو کی طرح ہے
جیسے سب کو جھنجھوڑتی ہے یہ
جب یہ چاہے تب ہوتا ہے

ننھی کلی کو چھیڑنا مشکل
آئینہ کرتی ہے یہ گھر کو
صبر کا پیکر ہوتی ہے یہ
یہ جو پڑھے ہر کوئی پڑھے گا
کیسی بھی ہو صورت حال
یہ ہے اچھے دن کی نوید
سب سے پیار جتانے والی
روٹھنے والی منےنے والی
پیار کی اک ندّی بہتی ہے
دکھ سہنے کی تاب ہے اس میں
اپنی موج میں جب آجائے
بےدھیانی میں دھیان کو چھانٹے
تپتی دھوپ میں چھاؤں جیسی
ہر دل کو سمجھانا ہوگا
جب جب پیاری بیٹی بچے گی

پیچھے مڑ کے دیکھنا مشکل
پیار سے یہ بھرتی ہے گھر کو
اتنی منور ہوتی ہے یہ
پڑھنے سے اس کے دیش بڑھے گا
ہمسائے کی یہ ہے مثال
اس سے ہے سب کو امید
دل کا بوجھ ہٹانے والی
نئی نسل کو جننے والی
ابو ابو جب کہتی ہے
زیست کا ہر اک باب ہے اس میں
ریگستان میں پھول کھلائے
ماں اور باپ کا دکھ سکھ بانٹے
ہے شہروں میں گاؤں سی جیسی
اسے ہمیں بچانا ہوگا
تب تب پیاری بیٹی پڑھے گی

■

Krishan Kumar Toor
134/E, Khanyara Road
Dharamshala- 176215
Mob.: 9816020854

نظم

ہوا چیختی ہے

متین اچل پوری

متین اچل پوری وظیفہ یاب مدرس ہیں۔ انہیں مثالی مدرس کے کئی ایوارڈ مل چکے ہیں۔ صدر جمہوریہ ہند کے ہاتھوں 1990 میں نیشنل ایوارڈ برائے مدرس حاصل کرچکے ہیں۔ ان کی مختلف کتابوں پر ریاستی اردو اکادمیوں نے بھی انعامات سے سرفراز کیا ہے۔ ادب اطفال کے باب میں ان کی بہت سی کتابیں ہیں۔ خاص طور پر ماحولیات برائے اطفال کے تعلق سے پرندوں کی دنیا، لاڈلے جانور، ماحول نامہ، ہم ماحول کے رکھوالے، ماحول کی خوشبو، ہوا اور پانی کے ترانے قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ قلم کے موتی، ننھے منے گیت، اکشر دھارا کے گیت، حرفوں کا پیغام، الفاظ کے شگوفے، ننھی منی استانی، یتیم کی آواز، ممتا کی ڈور کے نام لکھے جاسکتے ہیں۔ مہاراشٹر، تلنگانہ کی درسی کتابوں میں بھی ان کی کئی نظمیں اور اسباق شامل ہیں۔

نہ ایسے برے دن دکھاؤ مجھے
ہوا چیختی ہے، بچاؤ مجھے!

درختوں پہ آرے چلاؤ نہ تم
سنو ہوش اپنے گنواؤ نہ تم
زمیں لگ رہی ہے الاؤ مجھے
ہوا چیختی ہے بچاؤ مجھے

دھویں سے ہے آنچل مرا تار تار
سنو روٹھ کر جا رہی ہے بہار
خدا کے لیے مت ستاؤ مجھے
ہوا چیختی ہے بچاؤ مجھے

نہ سوراخ کشتی میں اپنی کرو
ارے نیک بندوں، خدا سے ڈرو
جہنم کے دن مت دکھاؤ مجھے
ہوا چیختی ہے بچاؤ مجھے

■

Mateen Achalpuri
Opp. Masjid, Akbari Chowk, Biyabani
Achalpur-444806
Dist Amravati (Maharashtra)
Cell: 09503199586

بادل

نظم

عزیز اللہ شیرانی

ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی اردو کے معروف مصنف ہیں۔ سینئر سیکنڈری ایجوکیشن ٹونک (راجستھان) میں پرنسپل کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکے ہیں۔ ان کی بہت سی کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں تعلیم و تدریس سے متعلق کتابوں میں اردو درس و تدریس (برائے بی ایڈ)، تعمیر اردو(سیکنڈ گریڈ اردو اساتذہ کے لیے)، آزمائش اردو (مقابلہ جاتی اردو اساتذہ امتحان کے لیے)، اردو زبان کی تدریس (برائے بی ایس ٹی سی)، اردو کا مراسلاتی نصاب، آؤ ہم پڑھیں (اول، دوم، سوم، پرائمر) قابل ذکرہیں۔ 'چھچھاہٹ' بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں کا مجموعہ ہے تو کامیابی کی کہانیاں' بچوں کی نصیحت آمیز کہانیوں کی کتاب ہے۔ بچوں کے رسائل و جرائد میں بھی ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہی ہیں۔

علم و ہنر کا آتا بادل اٹھلاتا بل کھاتا بادل
کھیتوں میں ہوجاتی ہل چل حرفوں کو برساتا بادل
اندھیاروں کو دور بھگاتا حرفوں کو بکھراتا بادل
لفظوں کو مِلواتا بادل رنگ نئے دکھلاتا بادل
'ب' بادل کی 'د' دادا کی 'ل' سے لکھ پڑھواتا بادل
گاؤں گاؤں میں دھوم مچاتا بچوں کے من بھاتا بادل
کبھی گرجتا کبھی برستا کھیتوں کو نہلاتا بادل
چلتا پھرتا پانی دیتا سب کی پیاس بجھاتا بادل
علم و فن کا آتا بادل اِٹھلاتا بَل کھاتا بادل

■

Dr. Azizullah Shirani
Farhat Manzil, Kali Paltan
Tonk - 304001 (Rajasthan)
Mob.: 9214984819, 8078602224

نظم

کورونا ہے

شکیل سہسرامی

فاصلے سے ملو کورونا ہے
ناک منھ کو ڈھکو کورونا ہے

تنہا تنہا رہو کورونا ہے
مت کسی سے سٹو کورونا ہے

گھر کے اندر رہو کورونا ہے
مت گلی میں پھرو کورونا ہے

ہر کسی سے کہو کورونا ہے
مت کسی سے لڑو کورونا ہے

سوئے بازار بے ضرورت تم
مت چلو مت چلو کورونا ہے

مستقل احتیاط لازم ہے
کان اس پہ دھرو کورونا ہے

موت کا وقت تو معین ہے
پھر بھی ڈرتے رہو کورونا ہے

بند اسکول ہیں ابھی سارے
گھر کے اندر پڑھو کورونا ہے

اتنی قربت ابھی درست نہیں
دور تھوڑا رہو کورونا ہے

ہے ہدایت یہی حکومت کی
بھیڑ میں مت چلو کورونا ہے

دعوتیں چھوڑ دو ابھی کچھ دن
بات میری سنو کورونا ہے

بھائی مجھ کو ذرا نکلنے دو
چنو منو ہٹو کورونا ہے

ہے یہ اعلان عہد حاضر کا
ہاتھ دھوتے رہو کورونا ہے

خود کو اے دوستو بہر صورت
صاف ستھرا رکھو کورونا ہے

باہری چیز کھانے پینے کی
مت کہیں بھی چکھو کورونا ہے

فائدہ ہو شکیل دنیا کو
نظم ایسی کہو کورونا ہے

فاصلے سے ملو کورونا ہے
ناک منھ کو ڈھکو کورونا ہے

■

Shakil Sahsarami
Near Rahman Masjid
Samanpura, Raja Bazar
Patna - 14 (Bihar)

صبیحہ سنبل

صبیحہ سنبل اردو کی مشہور شاعرہ ہیں اور سوشل میڈیا پر سرگرم ہیں۔ انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے اردو کی ڈگری لی ہے اور کمرشیل آرٹ سے ڈپلومہ کیا ہے۔ ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہوچکے ہیں جن میں حرف حرف کرن اور میلاد النبی راہ نجات قابل ذکر ہیں۔ انہیں کئی ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔ شاعری، مضمون نگاری، تبصرہ نگاری، افسانچہ نگاری سے ان کا خاص شغف ہے اور یہ اب بچوں کے لیے بھی لکھ رہی ہیں۔

عارش آؤ زینب آؤ — دیکھو ہے کیا دوڑ کے آؤ
زینب اور عارش چلائے — خوشی خوشی وہ دوڑ کے آئے
ارے یہ کیا ہے ڈبّے جیسا — یہ تو لگے ہے ٹی وی جیسا
نہیں نہیں یہ کمپیوٹر ہے — اب سے میرا یہ ٹیوٹر ہے
سب کچھ اس میں بھرا پڑا ہے — سب کا بس یہ ایک گھڑا ہے
سارے علموں کا یہ پٹارہ — کرتا ہے ہر سمت اشارہ
سائنس کا یہ ایک کرشمہ — سب نے پہنا اس کا چشمہ
کارٹون بھی دیکھوں گا میں — نئے کھیل بھی کھیلوں گا میں
گھر بیٹھے سب کچھ دکھلائے — دنیا بھر کی سیر کرائے
چلو چلو ہم کو دکھلاؤ — کچھ چیزیں ہم کو سکھلاؤ
یہ دیکھو میرا کمپیوٹر — اب یہ ہے ہم سب کا ٹیوٹر

■

Sabeeha Sumbul
Flat No: 206, Square Tower
Maris Road
Aligarh - 202002 (UP)

نظم

چارہ گر تم بننا سیکھو

تنویر اختر رومانی

تنویر اختر رومانی اردو کے معروف ادیب ہیں۔ انھوں نے کبیریہ اردو مڈل اسکول ذاکر نگر جمشید پور میں تدریسی خدمات انجام دی ہیں۔ بچوں کے رسائل میں ان کی تحریریں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'ببول' کے عنوان سے شائع ہوچکا ہے۔ ان کا پہلا افسانہ 'ندامت کے آنسو' ماہنامہ 'بتول' رامپور میں شائع ہوا تھا۔ یہ ایک ادبی سہ ماہی رسالہ 'عبارت' کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔ ان کی شخصیت پر ڈاکٹر اختر آزاد کی کتاب 'تنویر اختر رومانی: شخص اور افسانہ نگار' کے عنوان سے شائع ہوچکی ہے۔

عیب اوروں کے ڈھکنا سیکھو — منھ پھٹ تم مت ہونا سیکھو
جو ہیں رشتے دار تمھارے — ان سے ملنا جلنا سیکھو
مایوسی تو کفر ہے بچو — ہرگز کفر نہ کرنا سیکھو
مرنے کو تو سب مرتے ہیں — تم تو امر ہو جانا سیکھو
نادانوں کو کوئی نہ پوچھے — تم تو دانا بننا سیکھو
اوروں کا نقصان کرو تو — ہرجانہ بھی بھرنا سیکھو
تلخ زبانی سے تم بچنا — لہجہ شیریں رکھنا سیکھو
زخموں سے جو چور ہیں، ان کا — چارہ گر تم ہونا سیکھو

■

Tanweer Akhtar Roomani
59, Chuna Shah Colony
P.O.: Maango
Jamshedpur-831012 (Jharkhand)

اسکول جاتے ہیں

ڈاکٹر ضیاء الرحمن جعفری بہار شریف کے ہائی اسکول معافی نالندہ میں 10+2 میں ہندی کے استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں مگر اردو زبان و ادب سے ان کا بہت گھرا لگاؤ ہے اور بچو ں کے لیے ہندی اور ارد ودنو ں زبانوں میں لکھتے رہے ہیں۔ بچوں کے رسائل 'امنگ' نئی دھلی، روزنامہ 'قومی تنظم' پٹنہ، روزنامہ 'راشٹریہ سھارا' دھلی، 'ھلال' رامپور اور 'سائیکل' کولکاتا وغیرہ میں ان کی تخلیقات شائع ھوتی رھی ہیں۔ اردو میں 'میں آپی سے نھیں بولتی' کے عنوان سے بچوں کے لیے نظموں کا مجموعہ شائع ھوچکا ہے تو ھندی میں 'چاند ھماری مٹھی میں ہے' کے نام سے بچوں کے لکھی نظموں کی کتاب منظر عام پر آچکی ہے۔

ضیاء الرحمن جعفری

جب ہم بالکل چھوٹے تھے   نہیں ذرا بھی موٹے تھے
کرتے تھے سب پیار مجھے   دیکھتے سو سو بار مجھے
ممی دودھ پلاتی تھیں   نانی کپڑے لاتی تھیں
پاپا کیا کیا لاتے تھے   جھولے ہمیں جھلاتے تھے
پھر جب کچھ ہم بڑے ہوئے   دھرے دھیرے کھڑے ہوئے
لگے بولنے باتیں ساری   کھاتے روٹی اور ترکاری
اب اسکول کو جاتے ہیں   گھر میں کم رہ پاتے ہیں

■

Zeaur Rahman Jafri
High School Mafi
Via: Asthawan
Dt.: Nalanda - 803107 (Bihar)

نظم

چار بجے

محمد انس مسرور

محمد انس مسرور انصاری اردو کے معروف ادیب و شاعر ہیں۔ انھوں نے جامعہ اردو علی گڑھ سے کامل اور اودھ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا ہے۔ ان کی تقریباً 50 کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں بیشتر دینیات، ادبیات اور تاریخ پر محیط ہیں۔ بچوں کے رسائل میں بھی تواتر کے ساتھ ان کی تحریریں شائع ہوتی رہی ہیں۔ قومی اردو تحریک فاؤنڈیشن (ٹانڈہ) کے صدر کی حیثیت سے اردو زبان کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔

ہم نے جب اسکول سے اپنی چھٹّی پائی چار بجے
سڑکوں سڑکوں گلیوں گلیوں دھوم مچائی چار بجے
باہوں میں ہم باہیں ڈالے
جیسے اک دوجے کو سنبھالے
ہنستے گاتے شور مچاتے
گھر کی اُور بڑھے ہیں جاتے
جیل سے برسوں بعد ملی ہو جیسے رہائی چار بجے
ہم نے جب اسکول سے اپنی چھٹّی پائی چار بجے
کسی کی ٹانگ میں ٹانگ پھنسائی
کسی کے سر پر ایک جمائی
کسی نے میرے منھ کو نوچا
کسی کو جھٹ میں نے بھی دبوچا
چار طرف سے اک دوجے پر آفت آئی چار بجے
ہم نے جب اسکول سے اپنی چھٹّی پائی چار بجے
ہم اسکول سے جب گھر پہنچے
ڈیڈی بھی دفتر سے لوٹے
پہلے ہاتھ اور منھ کو دھویا
تب انسان بنے ہم گویا
جلدی جلدی ممّی نے بھی چائے بنائی چار بجے
ہم نے جب اسکول سے اپنی چھٹّی پائی چار بجے

■

Md. Anas Masroor
Sakrawal Urdu Bazar Tanda
Ambedkar Nagar - 224190 (UP)
Mob.: 9453347784

بچہ اور چاند

امان ذخیروی

امان ذخیروی معروف شاعر ہیں۔ اردو مڈل اسکول ذخیرہ جموئی (بہار) میں ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کی کئی کتابیں منظرعام پر آچکی ہیں جن میں پرندوں کا سفر(ہندی غزلوں کا مجموعہ)، نوائے شبنم (اردو نظموں کا مجموعہ)، گلہائے آرزو(رخصتی ناموں کا مجموعہ) قابل ذکر ہیں۔ بچوں کے لیے لکھی گئی ان کی نظموں کا ایک مجموعہ 'آغوش میں چاند' کے عنوان سے زیرترتیب ہے۔

چندا ماما کتنے پیارے
کب آؤ گے میرے دوارے
دور کھڑے ہنستے رہتے ہو
دنیا کو روشن کرتے ہو
کتنے نرمل کتنے شیتل
روپ تمہارا کتنا کومل
لیکن پیارے ماما آؤ
ہم کو بھی اک بات بتاؤ
تم پر یہ دھبہ کیسا ہے
درپن کیوں دھندلا، دھندلا ہے
چہرے پر کیوں داغ تمہارے
ہم کو بھی بتلاؤ پیارے
بچے کی یہ باتیں سن کر
بولے چندا ماما ہنس کر
ننھے منے راج دلارے
تم ہو بالکل بھولے بھالے
رب کی یہ قدرت ہے پیارے
جس کا جیسا روپ سنوارے
کوئی گورا کوئی کالا
ادنیٰ کوئی، کوئی اعلیٰ
کتنے گورے دل کے کالے
کتنے کالے ہیں دل والے
پھول کا چہرہ کتنا پیارا
اس پر بھی کانٹوں کا پہرا
کوئل گاتی کتنا میٹھا
لیکن چہرہ کالا ریٹھا
کون ہے جس سے عیب جدا ہے
دو جگ میں بے عیب خدا ہے

■

Amanullah Khan
Village: Prem Deeha, Post: Mohiuddin Nagar
Via: Sikandara, Distt: Lakhisarai - (Bihar)

محمود اشرف

ماحولیاتی انقلاب

تباہی قیامت بپا کررہی ہے
کہ آلودگی حد سے اب بڑھ رہی ہے
خود انسان اپنی ضرورت کی خاطر
نئی تکنیک کو کیا ہے یوں حاضر
کہ جس سے ہے خطرہ سبھی جانور کو
شجر کو، حجر کو ندی کو بشر کو
گلوبل کی بڑھتی مصیبت تو دیکھو
جو کرتی ہے مجروح انسانیت کو
یہ جنگلات کی روز بڑھتی کٹائی
مشینوں سے نکلے دھواں، گندہ پانی
یہی حال اپنا رہے گر ہمیشہ
تو ممکن نہ ہوگا کسی کا بھی جینا
سبھی کا ہے یہ فرض سب کو بچائے
ہر اک آدمی اک شجر تو لگائے
تحفظ کریں آج ماحول کا ہم
کہ فیوچر میں ہونے نہ پائے کوئی غم
جہاں صاف ستھری رہے یہ فضا
نہ ہو اس میں آلودگی کچھ سدا
وہ رنگین دنیا بنائیں گے ہم بھی
چلو انقلابات لائیں گے ہم بھی

■

Mahmood Ashraf
Ghar No.: 861, Gali No.: 04
Chandni Chowk, Islampura
Malegaon - 423203 (Maharashtra)

اخلاق کی دولت

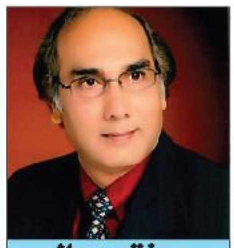
رونق جمال

رونق جمال اردو کے مشہور افسانہ نگار ہیں۔ افسانچے میں ان کی اپنی الگ پہچان ہے۔ تقریباً 20 برسوں سے بچوں کے رسائل میں ان کی تخلیقات شائع ہورہی ہیں۔ بچوں کی لکھی گئی ان کی کہانیوں کے تین مجموعے چالاک بجوکے، چھوٹا پولیس والا، سانپوں کی دنیا شائع ہوچکے ہیں۔ ڈراموں کا ایک مجموعہ 'ایک پریشان باقی انجان' منظرعام پر آچکا ہے۔ انھوں نے ایک نئی صنف بچکانچہ بھی ایجاد کی ہے۔ مجلہ 'گل بوٹے' کے عالمی سمینار میں ان کے بچکانوں کا پہلا مجموعہ 'ابا جان' کا اجرا ہوا تھا۔ ریڈیو اور ٹی وی پر بھی رونق جمال پروگرام پیش کرتے رہے ہیں۔

ایک شخص نہایت مالدار تھا۔اس کے پاس عیش و آرام کے لیے دنیا کی ہر چیز موجود تھی اور آمدنی بھی بے حد تھی۔ بیوی تھی، بچے تھے، رشتہ دار تھے لیکن وہ نہایت مغرور، بدمزاج اور بدرویہ ظالم آدمی تھا۔ اس کے ظلم و ستم کے سبب اس کی بیوی مسلسل بیمار رہنے کی وجہ سے بے چاری وقت سے پہلے ہی گزر گئی تھی۔ اولاد باپ کے ظالمانہ رویہ کی وجہ سے تنگ آکر دوسرے ممالک میں جابسی تھی۔ رشتہ دار غلطی سے بھی اس کی جانب رخ نہیں کرتے تھے۔ اڑوس پڑوس کے لوگ بھی اس سے کتراتے تھے اس لیے وہ تنہا زندگی گزار رہا تھا۔ وقت گزرتا گیا اس کا رویہ، مزاج اور غرور بھی عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا۔ گھریلو نوکر بھی گنے چنے رہ گئے تھے۔ مالی بھی اس کے برے سلوک کی وجہ سے کام چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ وہ خود ہی گرتے پڑتے باغیچے میں پائپ سے پانی ڈال کر پیڑ پودوں کو بچانے کی کوشش کررہا تھا۔

ایک روز ایک غریب بچہ کاغذ چنتے ہوئے اس کے عالی شان گھر کے شاندار دروازے کے سامنے پہنچا اور کاغذ اٹھانے لگا۔ بوڑھا اسے دیکھ کر چیخا۔

''ارے کیا کرتا ہے—!؟ چل بھاگ یہاں سے۔!!''

''کچھ نہیں کررہا ہوں انکل..... فالتو کاغذ پڑے ہیں انھیں اٹھا رہا ہوں!!''

''مت اٹھا..... چل بھاگ یہاں سے!!''

''انکل خفا مت ہوئیے!! کاغذ چھوڑے دیتا ہوں..... مگر ذرا یہاں آنے کی تکلیف گوارہ کریں!!''

بوڑھا گیٹ پر آکر گرجا۔ ''کیا

ہے!!؟؟"

"انکل! اتنی زور سے مت چیخیئے آپ کا گلا خراب ہوجائے گا۔ دیکھیے میں غریب ماں باپ کا بچہ ہوں۔ فالتو کاغذ اور جھلیاں چن کر بیچ دیتا ہوں اور اس طرح ماں باپ کا ہاتھ بٹا دیتا ہوں---!!

آپ مجھے غلط مت سمجھئے! میں آپ کی بھی مدد کرنا چاہتا ہوں.....!!"

"میری مدد.....!!!..... تم میری کیا مدد کرسکتے ہو!"

"آپ بہت بوڑھے ہیں انکل۔!! آپ پیڑ پودوں کو پانی بھی ڈھنگ سے نہیں دے پارہے ہیں۔ دیکھئے تھکان سے آپ کا جسم بھی کانپ رہا ہے۔آپ اجازت دیں تو میں اندر آکر پودوں کو پانی دے دیتا ہوں۔آپ آرام سے بیٹھ کر دیکھتے رہیے!!"

"ٹھیک ہے چل اندر آجا..... مگر کوئی چالاکی اور شرارت نہیں کرنا ورنہ میں پولس کو فون کرکے بلا لوں گا۔!"

بوڑھا اسے گھورتے ہوئے دروازہ کھول کر بولا۔

"انکل میں کوئی چور بدمعاش نہیں ہوں..... میں غریب و لاچار ہوں..... آپ کی اتنی بڑی کوٹھی ہے..... آپ کے بال بچے کہاں ہیں؟!! کوئی نوکر وغیرہ بھی دکھائی نہیں دے رہا ہے!!اتنی بڑی کوٹھی میں آپ اکیلے رہو ہو انکل۔!"

بچے کے سوالوں پر بوڑھا خاموش رہا اور دلان میں پڑی کرسی پر دراز ہوگیا۔ بچے نے پائپ سے پورے باغیچے کو پانی دیا اور صفائی بھی کردی۔ بوڑھا اسے لگن سے کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کام ختم ہوگیا تو بچے نے خلوص سے کہا:

"انکل لو آپ کے باغیچے اور تمام گملوں میں پانی ڈال دیا ہے۔تھوڑی بہت صفائی بھی کردی ہے۔آپ کو کام پسند آیا ہو تو مجھے اجازت دیجیے اور وہ باہر پڑے ہوئے کاغذ بھی لے جانے دیجیے۔!!"

"نہیں! پہلے تو میرے ساتھ اندر چلو۔!!"

"بچہ خاموشی سے بوڑھے کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ بوڑھا ایک کمرے میں داخل ہوکر رک گیا جہاں ڈھیر سارے اخبار و رسائل بے ترتیب پڑے ہوئے تھے۔ بوڑھا لڑکے سے مخاطب ہوکر بولا:

"تم یہ سب لے کر جاسکتے ہو!!"

"سچ انکل---!"

"ہاں تم روز آنا اور تم جتنا وزن اٹھا سکتے ہو اخبار لے کر جانا۔ اور ہاں یہ روپے اپنے پاس رکھ لو..... کل آتے وقت کسی ہوٹل سے کھانے کے لیے کچھ لیتے آنا!! آؤ گے نا بیٹا.....!!"

"ہاں..... ہاں انکل ضرور آؤں گا!!" کہہ کر لڑکا ڈھیر سارے اخبار لے کر چلا گیا۔ دوسرے روز ہوٹل سے کھانا لے کر کوٹھی پہنچا، بوڑھا اس کا انتظار کررہا تھا۔ لڑکے کو دیکھ کر بوڑھے کی باچھیں کھل گئیں۔ بوڑھے نے خوب سیر ہوکر کھایا اور باقی بچا ہوا کھانا لڑکے کو دے دیا۔ لڑکے نے بہت سارے اخبار اٹھائے اور اجازت لے کر جانے لگا تو بوڑھے نے اسے روپے دیے اور کل پھر سے کھانا لے کر آنے کو کہا۔ لڑکا روز آتا باغیچے میں پانی دیتا۔ اخبار کا بنڈل بناتا..... بوڑھے کو کھانا کھلاتا، برتن دھوکر رکھتا۔ کمرے کی صفائی کردیتا..... بوڑھے سے مزے دار باتیں کرتا۔ بوڑھا اب اس لڑکے سے کافی مانوس ہوگیا تھا اور بھروسہ بھی کرنے لگا تھا۔ کبھی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتا، کبھی اس کی پیٹھ تھپتھپا دیتا۔ لڑکے کو بھی بوڑھے سے انسیت ہوگئی تھی اس لیے وہ اخبار ختم ہوجانے کے باوجود بھی ہر روز آتا۔ بوڑھا بھی بے چینی سے اس کا انتظار کرتا رہتا۔ بوڑھے کو پہلی بار اس لڑکے سے اپنے پن کا

احساس ہونے لگا تھا۔ اس لیے بوڑھا اپنے مزاج، رویے اور سلوک کے برخلاف اس لڑکے کے ساتھ پیش آتا تھا۔ لڑکا بھی اب جی جان سے اس کی خدمت کرنے لگا تھا۔ ایک روز بوڑھے نے لڑکے سے کہا ''تم اپنے والدین کو بھی یہاں لے کر آجاؤ اور اس کوٹھی میں میرے ساتھ رہو—!! وہ لوگ بھی یہاں کام کریں گے میں انھیں بھی اچھی تنخواہ دوں گا۔'' لڑکے نے اپنے والدین سے بوڑھے کا ذکر کیا۔ اس کے ماں باپ آکر بوڑھے سے ملے اور کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں آکر رہنے لگے۔ یہ پرائے لوگ ہی اب بوڑھے کے لیے سب کچھ تھے۔ ایک روز اچانک بوڑھے کی طبیعت خراب ہوگئی۔ وہ لوگ اسے لے کر ایک بڑے اسپتال گئے جہاں بوڑھے کا معقول علاج شروع ہوگیا۔ بوڑھے نے ڈاکٹر سے کہہ کر اپنے وکیل کو طلب کیا۔ وکیل آیا تو بوڑھے نے وکیل کو چند ہدایتیں دیں۔ وکیل تمام ہدایتوں کو ایک کاغذ پر نوٹ کرکے چلا گیا۔ دو چار روز بعد وکیل پھر آیا۔ بوڑھے سے چند کاغذات پر دستخط لیے اور چلا گیا۔ ایک روز بوڑھے کو دواخانے میں دل کا شدید دورہ پڑا اور وہ انتقال کرگیا۔ ڈاکٹر نے وکیل کو خبر دی۔ وکیل فوراً اسپتال پہنچ گیا۔ دواخانے کا بل وغیرہ ادا کرکے بوڑھے کی لاش کو مردہ خانے میں رکھوا کر وکیل نے لوکل ٹی وی پر بوڑھے کے انتقال کی خبر چلوائی۔ اخبارات میں خبر چھپوائی، ٹی وی پر خبر دیکھ کر اور اخبارات میں پڑھ کر بوڑھے کے رشتہ داروں کا آنا جانا شروع ہوگیا۔ اطراف کے شہروں سے بھی بوڑھے کے رشتہ دار انتقال کی خبر سن کر پہنچنے لگے تھے۔ رشتہ داروں کی اجازت لے کر وکیل نے شہر کے قبرستان میں بوڑھے کو دفن کروادیا۔ تدفین کے ایک ہفتے بعد بوڑھے کے بیٹے بیٹیاں بھی غیر ممالک سے آدھمکے! وکیل نے ایک روز بوڑھے کے تمام رشتہ داروں، بہو بیٹوں اور دامادوں کو ہال میں جمع ہونے کے لیے کہا۔ جہاں بوڑھے کی وصیت پڑھی جانا تھی۔ ہال پہنچ کر سب وکیل کے منتظر تھے۔ وقت مقررہ پر وکیل آیا۔ بیگ سے ایک لفافہ نکال کر سب کے سامنے اسے کھولا اور کاغذ نکال کر بوڑھے کا وصیت نامہ پڑھنے لگا۔

''میں امجد خان ولد رستم خان پورے ہوش وحواس میں یہ وصیت نامہ تحریر کر رہا ہوں کہ ایک معمولی لڑکے احمد نے میرے برے سلوک، برے رویے اور بدمزاجی کے باوجود میری خوب خدمت کی۔ مجھے زندگی کے معنی سمجھائے، رشتوں کی اہمیت بتائی اور اپنے مزاج، حسن سلوک و پرمغز باتوں سے میرا دل جیت لیا اور میری بے معنی زندگی کو ایک معنی عطا کردیے۔ 75 سال کی طویل زندگی میں..... میں نے زندگی کا آخری ایک سال احمد کی وجہ سے خوب کھل کر جیا ہے اور زندگی کا خوب لطف اٹھایا ہے۔ میں احمد کا شکرگزار ہوں، اس لیے میں اپنی یہ کوٹھی، فیکٹری، بینک بیلنس اور غلہ جائیداد احمد کے نام کر رہا ہوں!!''

دیکھا آپ لوگوں نے احمد غریب ہونے کے باوجود خوش مزاجی، خلوص، اخلاق ومحبت کی دولت سے مالامال تھا۔ اس کی اس دولت نے اسے امجد خان کی کروڑوں کی دولت کا مالک بنادیا! اس لیے ہمیشہ ہر کسی سے اچھا سلوک کرنا چاہیے اور محبت وشفقت وخوش اخلاقی سے پیش آنا چاہیے۔ ہر کسی کو تو اس دنیا میں احمد کی طرح کروڑوں کی دولت نہیں مل سکتی! لیکن آخرت میں اللہ کی جانب سے جو دولت ملے گی اس کا اندازہ لگانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔!!!

■

Ronaq Jamal
'Kainat' Street No.: 9
New Adarsh Nagar,
Durg- 491001 (Chattisgarh)
Mob.: 8839034844

ایچ جی ویلز، انگریزی سے ترجمہ: عظیم اقبال

بنا پاؤں والے پاؤں کے نشان

دونوں لڑکے کیچڑ میں ننگے پاؤں کے تازہ نشان دیکھ کر حیرت میں تھے۔ لندن کے وسط میں برہنہ پا (ننگے پاؤں) شخص کسی گھر کی سیڑھیوں پر کیا کر رہا تھا—؟ اور وہ شخص کہاں تھا؟

اچانک ان کی آنکھوں نے حیرت ناک نظارہ دیکھا۔ جانے کہاں سے پاؤں کا ایک تازہ نشان نمودار ہو گیا!

مزید پاؤں کے نشان ایک کے بعد ایک آگے بڑھتے گئے۔ سیڑھیوں سے اتر کر گلی میں چلے گئے۔ لڑکوں نے تعاقب کیا، وہاں تک جہاں مدھم ہوتے ہوتے آخر میں وہ بالکل معدوم ہو گئے۔

اس راز کی تشریح حقیقتاً بے حد آسان تھی۔ متحیر لڑکے اس سائنسداں کے پیچھے لگے تھے جس نے کہ حال ہی میں تحقیق کی تھی کہ انسانی جسم کو شفاف نظر آنے والا کیسے بنایا جائے۔

سائنسداں گریفین نے ایک کے بعد ایک تجربے کیے تھے تاکہ وہ ثابت کر سکے کہ انسانی جسم یوں بنایا جا سکتا ہے کہ وہ غیر مرئی ہو جائے۔ آخر کار اس نے چند دوائیں نگل لیں اور اس کا جسم شیشے کی چادر کی طرح شفاف بن گیا، ہر چند کہ وہ شیشے جیسا ٹھوس بھی بنا رہا۔

وہ ایک ذہین سائنسداں تھا، لیکن گریفین ایک ایسا شخص تھا جو قانون کی پیروی نہیں کرتا تھا۔ اس کے گھر کی مالکن اسے ناپسند کرتی تھی اور اسے نکال باہر کرنے کے لیے کوشاں تھی۔ غیر مرئی بنے رہنے کے لیے اسے اپنے کپڑے اتار دینے پڑے۔ لہٰذا وہ ایسا آوارہ گرد بن گیا جس کا کوئی گھر نہ تھا، اس کے پاس پوشاک نہ تھی، پیسہ نہ تھا، اور وہ دکھائی نہ پڑتا تھا، جب تک وہ کیچڑ میں نہ اتر جائے... اور چلتے ہوئے اس کے قدموں کے نشان نہ ابھر آئیں!

لندن میں جو بچے اس کے قدموں کے نشان کا پیچھا کررہے تھے، ان کی نگاہوں سے وہ آسانی سے بچ نکلا، لیکن اس کے خطرات بھرے کام پوری طرح ختم نہیں ہوئے تھے۔ اس نے لندن میں بنا کپڑوں کے آوارہ گردی کرنے کے لیے ایک غلط وقت کا انتخاب کیا تھا۔ موسم سرد تھا اور وہ بے پوشاک ہوکر کام نہیں چلا سکتا تھا۔ شاہراہوں پر چہل قدمی کے بجائے اس نے گرمی کے لیے لندن کے بڑے اسٹور میں گھس جانے کا فیصلہ کرلیا۔

اسٹور کے بند ہونے کا وقت آن پہنچا اور جونہی دروازے بند کیے گئے، گریفین کو اس بات کی آسانی حاصل ہوگئی کہ وہ کپڑے پہن کر اور خرچ کی فکر کے بنا کھا پی سکے۔ اس نے کئی بکسے توڑ ڈالے اور گرم کپڑے پہن لیے۔ جلد ہی جوتے، اور کوٹ پہن کر وہ ایسا شخص بن گیا، جو دکھائی پڑتا تھا۔ ریستوراں کے کچن میں اس نے سرد گوشت اور کافی پالی، اور کھانے کے بعد مٹھائیاں لیں اور شراب پی، جو اس نے اسٹور سے نکالی تھی۔ آخر کار وہ رضائیوں کے ڈھیر پر لیٹ کر سوگیا۔

اگر گریفین ایک مناسب وقت پر جاگ جاتا تو سب کچھ بہتر ہوتا۔ ایسا ہوا کہ اگلی صبح کارندے جب تک پہنچ نہ گئے وہ بیدار نہ ہوا۔ جب اس نے ان میں سے ایک کو قریب آتے دیکھا تو وہ افراتفری میں بھاگ کھڑا ہوا۔ انھوں نے فطری طور پر اس کا پیچھا کیا۔ آخر میں پہنے ہوئے نئے کپڑے جھٹ پٹ اتار کر فرار ہونے کے قابل ہوا۔ لہٰذا ایک بار پھر سے وہ غیر مرئی ہوگیا، لیکن جنوری کی سرد ہوا میں برہنہ بھی تو تھا۔

اس دفعہ اس نے فیصلہ کیا کہ ایک تھیٹر کمپنی میں پناہ لے، جہاں وہ کپڑے حاصل کرسکے اور کندھوں کے اوپر کے خالی حصے کو بھی چھپا سکے۔ ٹھنڈ سے کانپتے ہوئے وہ جلدی جلدی تھیٹر کی دنیا کے مرکز میں ڈروری لین میں پہنچ گیا۔

جلدی ہی اسے ایک موزوں دکان مل گئی۔ وہ داخل ہوا اور اوپر چلا گیا، کیونکہ وہ دکھائی نہ پڑتا تھا، لیکن تھوڑی دیر بعد اپنی پیشانی کو پٹیوں سے ڈھک کر، رنگین چشمہ چڑھائے، نقلی ناک چڑھائے، کنپٹیوں پر داڑھی چپکائے، اور ایک ہیٹ چڑھائے باہر نکلا۔ اسی مقصد سے کہ وہ دکھائی نہ پڑے اس نے دکاندار پر عقب سے دھاوا بول دیا اور پھر جتنا پیسہ ہتھیا سکتا تھا، لے کر چلتا بنا۔

یہ سوچ کر کہ وہ بھیڑ بھاڑ والے لندن سے باہر نکل جائے، اس نے ایک ٹرین پکڑی اور آئی پنگ گاؤں پہنچ گیا، جہاں اس نے مقامی سرائے میں دو کمرے کرائے پر لیے۔ جاڑے میں کسی اجنبی کا ایک سرائے میں ٹھہرنا ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ ایک اجنبی، جس کے اطوار اس قدر غیر معمولی تھے کہ ہر طرف زبانیں ہلنے لگیں۔ مالکن، میز ہال نے کوشش کی کہ وہ دوستی دکھائیں، لیکن گریفین میں بات کرنے کی کوئی خواہش نہ تھی۔ اس نے ان سے کہا—

”آئی پنگ میں میرے آنے کی منطق یہ ہے کہ میں تنہائی چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری مشغولیت میں کوئی مخل ہو۔ مزید یہ کہ ایک حادثے نے میرے چہرے کو متاثر کیا ہے۔“

اس سے مطمئن ہوکر کہ اس کا اجنبی مہمان ایک جھکّی سائنسداں ہے، اور اس نے پیشگی ادائیگی کردی ہے، مسز ہال اس بات کے لیے تیار ہوگئیں کہ اس کی نامانوس عادتوں اور چڑچڑاہٹ نیز طیش کو نظر انداز کردیں، لیکن چرائی ہوئی رقم زیادہ دنوں تک کام نہ آئی— اور تھوڑے وقفے کے بعد گریفین کو اعتراف کرنا پڑا کہ اس کے پاس نقد کچھ نہیں ہے، تاہم اس نے بہانہ بنایا کہ ایک چیک کی کسی بھی وقت آنے

کی امید ہے—

اس کے فوراً بعد ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک دن علی الصبح ایک راہب اور اس کی اہلیہ مطالعے کے کمرے میں شور سن کر بیدار ہوگئے۔ سیڑھی سے نیچے جاتے ہوئے انھوں نے آواز سنی کہ راہب کی دراز سے ریزگاریاں نکالی جارہی ہیں—

بنا ہنگامہ کیے اور آگ کریدنے کی سلاخ مضبوطی سے تھامے ہوئے راہب نے کھٹاک سے دروازہ کھول دیا۔

''دست بردار ہوجاؤ!''

تب یہ آگہی ہوئی کہ کمرہ تو خالی ہے، وہ متعجب ہوا۔ وہ اور اس کی اہلیہ نے میز کے نیچے، پردوں کے اوپر، چمنی کے اوپر بھی دیکھا۔ کسی شخص کے ہونے کا کوئی نشان نہ تھا۔ پھر بھی میز کی دراز کھولی گئی تھی اور اخراجات کے لیے جو پیسے رکھے گئے تھے، لاپتہ تھے۔

''غیر معمولی بات ہے!''

باقی سارے دن راہب بکتا رہا۔

لیکن کچھ بھی غیر معمولی نہ تھا، جیسا کہ اس صبح تھوری دیر بعد مسز ہال کے فرنیچر کا احوال رہا۔

گھر کے مالک اور ان کی اہلیہ اس دن بہت سویرے جاگ پڑے تھے۔ انھیں تعجب ہوا کہ سائنسداں کا دروازہ کھلا پڑا ہے۔ معمول کے طور سے یہ بند رہتا تھا اور مقفل رہتا تھا۔ اسے غصہ آیا کہ کوئی کمرے میں داخل نہ ہوگیا ہو۔ یہ ایسا موقع تھا کہ اسے گنوایا نہیں جاسکتا تھا۔ انھوں نے دروازے سے اندر کی جانب جھانکا، کوئی نہ تھا۔ پھر انھیں خیال آیا کہ اس کی پرکھ کی جائے۔ بستر کے کپڑے سرد تھے۔ ظاہر ہوتا تھا کہ سائنسداں کچھ پہلے بیدار ہوچکا ہے اور یہ تعجب کی بات تھی کہ سائنسداں جن پٹیوں اور پوشاک میں ہمیشہ ملبوس رہتا تھا، کمرے کے وسط میں پڑی ہوئی تھیں—

اچانک مسز ہال نے اپنے کان کے پاس کسی کے ناک سڑکنے کی آواز سنی۔ لمحہ بھر کے بعد بستر کے ڈانڈے پر ٹنگی ہیٹ اچھل کر ان کے چہرے سے آٹکرائی۔ تب خواب گاہ کی کرسی میں جان آگئی، ہوا میں اچھل کر وہ ان کے چہرے سے ٹکرائی، پھر پیر سے، خوف زدہ ہوکر وہ اور ان کے شوہر باہر کی طرف مڑے، غیر معمولی کرسی نے دھکیل کر انھیں کمرے سے باہر کیا اور زور کی آواز کے ساتھ دروازہ بند ہوکر مقفل ہوگیا—

مسز ہال گھبراہٹ میں تقریباً سیڑھیوں پر گر پڑیں۔ انھیں یقین ہوگیا کہ کمرے میں بدروحیں ہیں۔

''والدہ بیچاری اس کرسی پر بیٹھا کرتی تھیں۔'' وہ کراہ اٹھیں۔ ''کیا عجیب ہے کہ اب وہی اٹھ کر مجھ سے ٹکرائی ہوں؟!''

ہم سایوں میں یہ بات عام ہوگئی کہ یہ سب جادو کی وجہ سے ہوا ہے، لیکن جادو ہو یا نہ ہو، راہب کے گھر میں نقب زنی کی بات مشہور ہوگئی تو یہ بات عام ہوئی کہ نامانوس سائنسداں اس میں یقیناً ملوث ہے۔ شبہ مزید اس وقت بڑھ گیا جب اس نے کچھ نقد پیسہ جمع کرایا۔ تھوڑے قبل ہی اس نے اعتراف کیا تھا کہ اس کے پاس پیسہ نہیں ہے۔

راز داری کے ساتھ گاؤں کے کانسٹبل کو بلا بھیجا گیا۔ کانسٹبل کا انتظار کیے بنا مسز ہال سائنسداں کے پاس پہنچ گئیں، جو اب کسی طرح پراسرار طور سے خالی بستر سے نمودار ہوچکا تھا۔

''میں جاننا چاہتی ہوں کہ تم اوپر میری کرسی کے ساتھ کیا کر رہے تھے۔'' انھوں نے پوچھ لیا— ''اور میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم خالی کمرے سے باہر کیسے آئے، اور تم ایک مقفل کمرے میں کیسے داخل ہوگئے۔''

سائنسداں کو طیش بہت جلد آتا تھا— اب وہ تلملا اٹھا—

’’آپ نہیں سمجھتیں کہ میں کون ہوں!‘‘ وہ چلا پڑا—

’’خوب! آپ کو دکھا دوں گا—‘‘

اچانک اس نے پٹیاں پھینک دیں، داڑھی، شمہ اور ناک بھی! ایسا کرنے میں اسے ایک منٹ لگا۔ خوف زدہ لوگ جو وہاں موجود تھے، ایک بے سر کے آدمی کو تا کے جا رہے تھے!

کانسٹیبل، مسٹر جیفرز اب پہنچ گئے تھے۔ انھیں حیرت تھی کہ انھیں ایک بے سر والے آدمی کو گرفتار کرنا تھا۔ لیکن جیفرز نے اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں دکھائی۔ اگر مجسٹریٹ کا فرمان ہوتا تو وہ کسی کو ضرور گرفتار کرتا، اس کا سر ہو یا نہ ہو!

وہاں ایک عجیب نظارہ تھا۔ جوں جوں پولس والا اسے پکڑنے کی کوشش کرتا، وہ نظر سے اوجھل ہوتا جاتا، کیونکہ ایک کے بعد ایک اپنے کپڑے وہ اتار رہا تھا۔

آخر میں ایک قمیص ہوا میں لہرا گئی اور کانسٹیبل کو لگا کہ وہ کسی سے، جسے وہ بالکل دیکھ نہیں پا رہا تھا، بھڑا ہوا ہے۔

کچھ لوگ اس کی مدد کی کوشش کر رہے تھے، لیکن نامعلوم جگہ سے مکے لپکتے اور انھیں مار جاتے—

آخر میں جیفرز نے جب نہ دکھائی دینے والے سائنسداں کو پکڑنے کی کوشش کی تو اسے ٹھوکر مار کر بے ہوش کر دیا گیا۔

گھبرائی ہوئی، برانگیختہ آواز بلند ہو رہی تھی۔ ’’پکڑو اسے!‘‘ لیکن کہنا، کرنے کی بہ نسبت آسان تھا— کوئی نہیں جانتا تھا کہ اسے کیسے پکڑیں!

■

Azim Iqbal
Adabistan
Ganj No 1
Bettiah - 845438 (Bihar)

منظر مظفرپوری

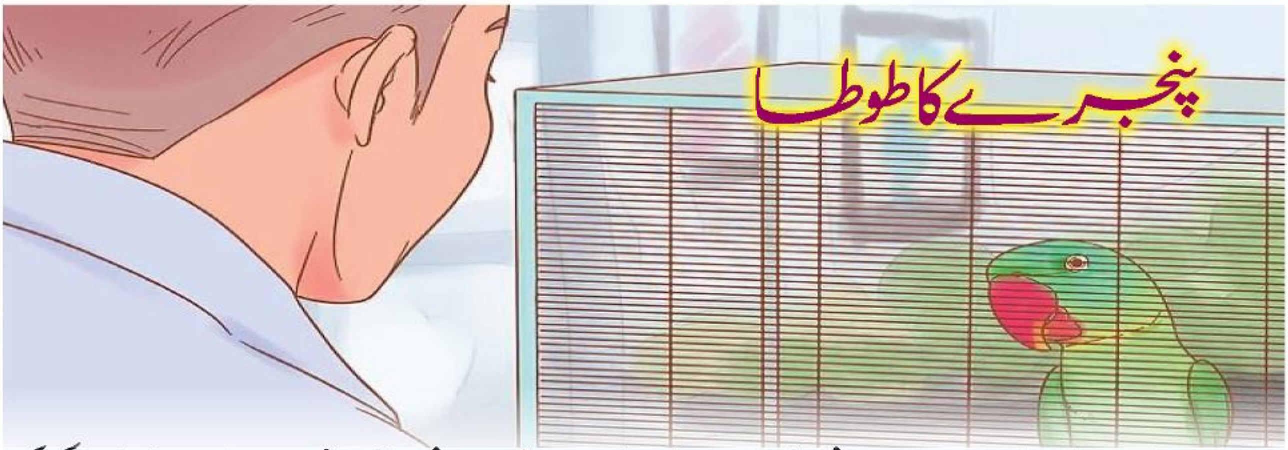

پنجرے کا طوطا

پنجرے میں قید طوطا مجھ سے بہت ناراض تھا۔ میں نے اسے غلیل سے گھائل کر کے پکڑا تھا۔ حالانکہ گولی ٹانگ میں لگی تھی اور معمولی چوٹ آئی تھی، اس لیے اس کی زندگی خطرے سے باہر تھی۔ البتہ کھانا پانی چھوڑ دینے سے اس کی صحت ضرور خراب ہونے لگی تھی۔

ایک معمولی پرندے میں اپنی آزادی کے لیے اتنا زبردست احتجاج دیکھ کر میں حیران تھا۔ ساتھ ہی اس کی بگڑتی صحت کو لے کر فکرمند بھی تھا۔ میں پوری کوشش میں تھا کہ طوطا اپنی آزادی کے غموں کو بھول کر قید و بند کی زندگی سے سمجھوتہ کر لے اور راضی خوشی سے میرا دوست بن جائے لیکن طوطا تھا کہ اپنی ضد سے باز نہیں آ رہا تھا۔ پر میں بھی اس سے کم نہیں تھا۔ اس کی بھوک ہڑتال ختم کروانے کے لیے میں اس سے زور زبردستی سے پیش آنے لگا تھا۔ پھر بھی وہ میری سختی کے آگے نہیں جھکا۔

میں طوطے کو پنجرے سے باہر نکال کر اس کے منہ میں جبراً دانہ ٹھونس دیتا لیکن وہ فوراً اگل دیتا۔ پانی بھی نہیں پیتا۔ عجیب پرندہ تھا۔ میں اسے شکست دینا چاہتا تھا اور وہ مجھے ہرانے پر آمادہ تھا۔

پرندے اور انسان کی اس لڑائی کو دادا جان خاموشی سے دیکھتے رہتے تھے۔ واضح رہے کہ طوطے کی طرح دادا جان بھی مجھ سے سخت ناراض تھے۔ جس روز میں نے طوطا پکڑ کر پنجرے میں ڈالا تھا، اس روز انھوں نے مجھے خوب ڈانٹ لگائی تھی۔ ساتھ ہی سمجھایا بھی تھا کہ آزادی کو قید و بند میں تبدیل کرنا سخت عذاب ہے۔ آزادی ہر جاندار کا فطری حق ہے۔ غلامی اور قید و بند کسی بھی ذی حیات کو پسند نہیں ہے۔

ہندوستان کو جب انگریزوں نے غلامی کی زنجیروں میں جکڑنا چاہا تو پورے ملک میں انقلاب کی لہر دوڑ گئی تھی۔ دیش کو آزادی دلانے اور کھلی فضا میں پھر سے تازہ دم رہنے کے لیے اہل وطن نے ڈٹ کر فرنگیوں سے مقابلہ کیا۔ ایسی لڑائی میں انھوں نے کیسے کیسے مظالم سہے پھر بھی آزادی کے متوالوں نے ہمت نہیں ہاری۔ یہاں تک کہ اپنے پیدائشی حقوق کے حصول کے لیے کتنے لوگوں کو اپنی جان کی قربانی تک دینی پڑی۔

آخر میں جب انگریزوں کو یہ یقین ہوگیا کہ واقعتاً، آزادی جان سے زیادہ عزیز ہے، تب انھوں نے اپنے قدم پیچھے ہٹا لیے اور ہندوستان چھوڑ کر واپس چلے گئے۔“

میں دادا جان کی باتیں بے دلی سے سن رہا تھا۔ آخر میں انھوں نے یہ بات سخت لہجے میں کہی تھی کہ ”فرنگیوں کی یہ حرکت اب تم دہرا رہے ہو جس میں تمھاری ہار ہوگی اور اس لاچار و مظلوم پرندے کی جیت ہوگی۔

طوطا اگر گھائل نہ ہوتا تو یقیناً دادا جان اُسی روز طوطے کو

پنجرے سے نکال کر اڑا دیتے۔

طوطے کو پنجرے میں قید کیے تیسرا روز تھا۔ آب و دانہ کے بغیر وہ کافی لاغر ہو گیا تھا۔ ہر وقت اونگھتا رہتا۔ میں نے اس کی جسمانی و ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانے کے لیے ایک پتلی سی چھڑی سے کریدا تو اس نے احتجاج جتاتے ہوئے چھڑی پر چونچ سے دو ایک بار حملہ کرنے کی کوشش کی، پھر سست ہو کر اونگھنے لگا۔

طوطے کی یہ تشویش ناک حالت دیکھ کر میں اس کی زندگی سے مایوس ہو گیا تھا۔ اسکول گیا تو پڑھائی میں ذرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ ہر پل طوطے کی فکر ستاتی رہی۔ اسی دوران میرے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا۔ چھٹی کی گھنٹی لگنے ہی والی تھی کہ مجھے واش روم (بیت الخلا) جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

ابھی میں واش روم میں ہی تھا کہ چھٹی کی گھنٹی بج گئی۔ میں نے واش روم کا دروازہ کھول کر فوراً باہر نکلنا چاہا، پر دروازہ نہیں کھلا۔ کسی شرارتی لڑکے نے باہر سے دروزہ بند کر دیا تھا۔ دروازہ کھلوانے کے لیے میں اندر سے کافی چیخا چلایا لیکن چھٹی ملنے کی خوشی میں بچے اتنا شور مچا رہے تھے کہ میری آواز کسی نے نہیں سنی۔

کافی دیر بعد میرے چیخنے چلانے پر اور دروازہ پیٹنے کی آواز سن کر اسکول کے اسٹاف نے مجھے قید سے چھٹکارا دلایا۔ اس دوران مجھے جیسی جیسی صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا، میرا دل ہی بہتر جانتا ہے۔ کچھ ہی دیر میں قید و بند کی تکلیف گھٹن بن کر میرا دم لینے لگی تھی۔ آزادی کتنی روح افزا ہوتی ہے، اور قید و بند کی زندگی کتنی اذیت ناک، اس کا احساس مجھے بیت الخلا میں بند رہنے کے دوران شدت سے ہوا تھا۔ پنجرے میں بند طوطے کی یاد مجھے مسلسل پریشان کرنے لگی تھی۔ میں نے تہیہ کیا کہ گھر پہنچنے کے بعد اس کے زخم کا علاج کراؤں گا اور اس کے ٹھیک ہوتے ہی کھلے آسمان میں اڑا دوں گا۔

اسکول سے جب میں گھر لوٹا تو فوراً پنجرے کے پاس گیا اور لاچار نظر آ رہے طوطے سے بولا، ”بھائی تو جیت گیا اور میں ہار گیا۔“

”وہ تو تمھیں ہارنا ہی تھا۔ ظالموں کی کبھی جیت نہیں ہوتی۔“ پیچھے کھڑے دادا جان کی آواز سن کر میں پلٹا اور ان سے لپٹ کر رونے لگا۔

”دادا جان، آپ مجھے معاف کر دیں۔ مجھے اپنی غلطی اور آزادی کی قیمت کا احساس ہو چکا ہے۔“

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

”اس شعر کا مفہوم اب سمجھ میں آ گیا ہے دادا جان۔“

”بے شک آزادی کے متوالے اس لیے جاں باز ہوتے ہیں، کیونکہ انھیں آزادی اپنی جان سے زیادہ پیاری ہوتی ہے اور آزادی کا تمنائی چاہے پرندہ ہی کیوں نہ ہو۔“

”جیتے رہو۔“ میری باتیں سن لینے کے بعد دادا جان نے سر پر دست شفقت پھیرتے ہوئے مجھے دعا دی۔

علاج و معالجہ کے بعد جب طوطا ٹھیک ہو گیا تو میں نے اسے پنجرے سے آزاد کرنے میں ذرا دیر نہ کی۔

طوطے کو آسمان کی وسعت میں پرواز بھرتے دیکھ کر مجھے دلی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔“

■

Manzar Muzaffarpuri
C/o Darbar Market Mehdi Hasan Road
Brampura, Post: M.I.T
Muzaffarpur - 842003 (Bihar)

سہیل سالم

بدلاؤ

یہ جون کی تپتی دوپہر تھی۔ سورج اپنے جوبن پر تھا۔ اصغر کا حلق جیسے سوکھ گیا تھا۔ بھوک سے اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ اصغر کو یاد آیا کہ فریج میں کولڈ ڈرنک اور کچھ کھانے کی چیزیں موجود ہیں۔ آج تو میرا روزہ ہے وہ بھی پہلا نہیں نہیں... میں ایسا نہیں کرسکتا۔ ہاں تو کیا ہوا ویسے بھی یہاں کون دیکھ رہا ہے؟ لفظ ہونٹوں پر کانپنے لگے تھے..... ہاں..... ہاں..... نہیں..... اللہ کی نگاہ ہر ایک پر ہوتی ہے۔ دادی اپنے کمرے میں نماز پڑھ رہی ہیں۔ امی اور بابا ویسے گھر پر نہیں ہیں۔ ارم ابھی بہت چھوٹی ہے اس کو کیا پتا.....

اپنی چھوٹی بہن کا خیال آتے ہی اصغر سوچ میں پڑ گیا۔ ارم کو کیا پتا روزہ کیا ہوتا ہے۔ اب اصغر کے دل ودماغ ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ فریج میں قسم قسم کے کھانے اور لذیذ میوے صاف نظر آرہے تھے۔ یہ لذیذ میوے سوکھے حلق کو سیراب کر سکتے تھے۔ لیکن اللہ کی ناراضگی کے خوف کا خیال غالب آنے لگا تھا۔

اصغر نے فریج کا دروازہ بند کیا۔ اب اصغر اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ ابھی تک اصغر بھوک اور پیاس کی وجہ سے تکلیف میں تھا۔ اپنی توجہ ہٹانے کے لیے ٹی وی ریموٹ پکڑا اور چینل تبدیل کرنے لگا۔ ایک چینل پر جیسے اس کی انگلیاں ریموٹ پر جم گئی تھیں۔ یہ چینل شام (Syria) پر رپوٹ دکھا رہا تھا۔ جس میں شام کے بچوں کو جب اناج کا ایک پیکٹ دیا جاتا تو سب اس پر جھپٹ پڑتے۔ یہ پیکٹ ہیلی کاپٹر کے ذریعے پھینکے جارہے تھے۔ اصغر کو یاد آگیا کہ ایک دن جب اس نے اسٹرابیری کیک آرڈر کیا تھا تو کیک لے کر آنے والا لڑکا غلطی سے دوسرا کیک لے آیا تھا۔ اصغر نے اس لڑکے کو برا بھلا کہا تھا، کیک لے کر اس لڑکے کے سامنے پھینک دیا تھا۔ اصغر کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھومنے لگا۔ جیسے کسی برے خواب نے اس کی آنکھیں کھول دی ہوں۔ اصغر نے موٹر سائیکل کی چابی پکڑی اور حیدر کے گھر جانے کا ارادہ کیا۔ اصغر اور حیدر کلاس فیلو بھی تھے۔ حیدر کا گھر کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ جب

بھی فارغ ہوتا حیدر کے گھر چلا جاتا تھا۔اصغر جب حیدر کے گھر پہنچا۔گھر کے لان میں مقبول چچا کام کررہے تھے۔مقبول چچا حیدر گھر پر ہے؟ نہیں بیٹا گھر پر تو کوئی نہیں۔چلیں ٹھیک ہیں۔حیدر واپسی کے لیے مڑا ہی تھا کہ کیا دیکھتا ہے کہ مقبول چچا کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔یہ مقبول چچا عرصہ دراز سے حیدر کے گھر کے باغ کی دیکھ بھال کرتے تھے۔اصغر نے کبھی بھی کام کرنے والوں میں کوئی دلچسپی نہ لی تھی۔مقبول چچا کیا آپ نے روزہ رکھا ہے؟ اصغر نے کانپتے ہاتھوں سے پودوں کو درست کرتے مقبول چچا سے سوال کیا.....

جی بیٹا الحمد للہ روزے سے ہوں۔مقبول چچا آپ روزے کے ساتھ سخت محنت کرتے ہیں۔آپ کو بھوک اور پیاس نہیں لگتی؟ بیٹا لگتی تو ہے لیکن جس اللہ کے لیے میں یہ تکلیف برداشت کرتا ہوں ۔وہ پروردگار صبر بھی دیتا ہے۔بیٹا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''روزہ خاص میرے لیے ہے اس کا اجر بھی میں دوں گا۔'' میرا رب جس کام کا اجر دینے کے لیے خود کہہ رہا ہو تو بیٹا میں دنیا کے کاموں کے لیے کیوں چھوڑ دوں۔ ''اچھا مقبول چچا اب میں چلتا ہوں۔اصغر گھر پہنچا اس کے ابو فیکٹری سے آچکے تھے۔ابو جی میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔کہو میرے جگر ''اصغر کے ابو نے پیار بھرے لہجے میں کہا ۔ابو اگر ہمارا پیٹ تھوڑے سے کھانے سے بھر سکتا ہے تو ہم کیوں مختلف اقسام کے کھانے بناتے ہیں۔کیا مطلب؟ میں کچھ سمجھا نہیں بیٹا آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟..... ابو جی میرا مطلب ہے ہمارے گھر میں روز کئی قسم کے کھانے پکتے ہیں جبکہ ہم سب تو اس میں سے تھوڑا سا کھاتے ہیں باقی سب ضائع ہوتا ہے۔کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم اپنی خوشیوں میں لوگوں کو شامل کریں۔اس طرح سے کھانا بھی ضائع نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ثواب بھی دیں گے۔امی ٹیبل پر افطار کا سامان لگانا شروع کرچکی تھیں۔آج شیخ شوکت اپنے بیٹے اصغر کی باتیں سن کر خوش ہو رہے تھے۔

ہاں کیوں نہیں بیٹا! اچھا مسلمان تو وہی ہے جو اپنے دوسرے بھائیوں کو اپنی خوشی میں شریک کرے۔۔آج معصوم بچے نے پھر شیخ شوکت کو بیدار کیا..... کچھ لمحوں بعد قریبی مسجد سے افطار کی دعا کی آواز آنے لگی۔ہاتھ دعا کے لیے آسمان کی طرف بلند ہونے لگے۔

آج اصغر کی آنکھوں میں نمی تھی۔مگر یہ بدلاؤ کی نمی تھی جو شیخ شوکت نے بھی محسوس کی۔

■

Suhail Salim
Dept of Urdu
Kashmir University
Srinagar - 190003 (J&K)

گوہر رفیع شاذ

آبشار

بچوں کی زندگی بالکل آبشار کی مانند ہوتی ہے۔ جیسے جھرنوں کا پانی کلکل... چھلچھل... کرتا ہوا پتھروں اور پہاڑوں کا سینہ چاک کر کے آگے بڑھتا رہتا ہے۔ کبھی چھوٹے چھوٹے ندی نالوں کی شکل میں تو کبھی دریا اور سمندر کے روپ میں۔

ٹھیک اسی طرح بچوں کی زندگی بھی زمانے کے تھپیڑوں اور مشکل سے مشکل راہوں کا جگر چاک کر کے آگے بڑھتی رہتی ہے اور جب وہ ایک کامیاب و مہذب انسان بن جاتے ہیں تو بالکل آبشار کی طرح ہی اونچ نیچ، ذات پات، چھوٹے بڑے اور امیر وغریب کچھ بھی نہیں دیکھتے بلکہ سب کو سیراب کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہتے ہیں۔

لیکن جب گلوبل وارمنگ یعنی زمین کے رفتہ رفتہ بڑھتے ہوئے درجۂ حرارت کی وجہ سے پہاڑوں پر جمی ہوئی برف زیادہ سے زیادہ پگھلنی شروع ہوجاتی ہے اور پانی کی بہتات کھیتوں کی ہریالی بخشنے کے بجائے سیلاب اور سونامی لہروں کی شکل میں گاؤں کے گاؤں اور شہر کے شہر تباہ و برباد اور ویران کرنے لگتی ہے، تب لوگوں کے لیے مشکلات بڑھ جاتی ہیں۔

ٹھیک اسی طرح جب کوئی انسان زمانے کی گردشوں اور دشواریوں سے گھبرا کر یا کسی طرح کی حرص ولالچ میں پڑ کر غلط راستہ اختیار کر لیتا ہے، تب اس کی زندگی جہان والوں کے لیے رحمت کے بجائے زحمت بن جاتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آبشار اور انسانوں کا رشتہ برسوں سے چولی دامن کا رہا ہے اور اس کی زندہ مثال آج کل بڑے بڑے گھرانوں میں باتھ روم کے اندر بھی نظر آتی ہے۔

لیکن پہاڑوں کے جھرنوں کی بات ہی کچھ الگ ہے۔ قدرت کے ان حسین وجمیل اور دلکش نظاروں سے ہی متاثر ہو کر زیادہ تر سیاح جگہ جگہ سیر وتفریح کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کبھی وہ کشمیر کی ڈل جھیل اور شالیمار و نشاط باغ کی رعنائیوں میں کھوئے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو کبھی شملہ کی

ٹھنڈی ٹھنڈی آب و ہوا میں سفید سفید برف اور تر و تازہ سیبوں کا مزہ لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کبھی وگوا اور اُوٹی میں گھومتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو کبھی دارجلنگ کی سب سے اونچی چوٹی یعنی ٹائیگر ہیل پہ بیٹھے بیٹھے بالکل قریب سے آفتاب کے نکلنے کا حسین و دلکش منظر دیکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ان سیاحوں میں کچھ ڈاکٹر، کچھ انجینئر، کچھ سرکاری ملازم، کچھ کل کارخانے اور فیکٹریوں والے، کچھ کسان و مزدور اور کچھ اسکول و کالج کے طلبہ بھی ہوتے ہیں۔ غرضیکہ سیر و تفریح کی دنیا ہی الگ ہوتی ہے اور اس کا شوق سیاحوں کو نہ جانے کہاں سے کہاں تک لے کر چلا جاتا ہے۔

اکرم، وکرم اور رمیش تینوں دوست ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے اور وہ ایک ہی ساتھ اپنے اسکول کی جانب کئی بار اور کئی جگہوں کی سیر و تفریح کر چکے تھے اور یہ سلسلہ تعلیم مکمل اور منقطع ہونے کے بعد بھی جاری تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے وہ اپنے دوستوں کے ساتھ جاتے تھے جب کہ بعد میں وہ اپنے خاندان اور رشتے داروں کے ساتھ جایا کرتے تھے۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتے ایک لنگڑے فقیر سے اکثر ان کی ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ اس کا دایاں پیر گھٹنوں تک کٹا ہوا تھا اور بائیں پیر میں بھی جگہ جگہ کٹے ہوئے نشانات تھے۔ اس لیے وہ بیساکھی کے سہارے چلتا تھا۔ اس کے باوجود بھی وہ پتھریلے، نوکیلے اور خطرناک سے خطرناک راستوں سے کافی تیزی کے ساتھ اور بڑے ہی اطمینان سے گزر جاتا تھا۔ اس کے اس حیرت انگیز کارنامے پر سب اس کی خوب تعریف کیا کرتے تھے۔ اپنی اس طرح تعریف سن کر وہ بہت خوش ہوتا تھا اور اپنا سینہ پھلا کر کہتا تھا کہ ”اب میری زندگی میں رہ ہی کیا گیا ہے؟ بس ایک چلتی پھرتی لاش ہوں۔ اس لیے دل میں کسی طرح کا خوف نہیں ہے اور جب انسان کے دل سے ڈر نکل جاتا ہے تو وہ کوئی بھی خطرناک سے خطرناک کام کرنے سے کبھی گھبراتا نہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے بچائے جن کے دل سے خوف خدا نکل گیا ہو۔“

اس کی ایسی باتوں سے وہاں حاضر تمام سیاح کافی خوش ہوتے تھے اور اسے زیادہ سے زیادہ پیسے بھی دیتے تھے مگر کبھی کبھی وہ باتیں کرتے کرتے اچانک گمبھیر ہو جاتا تھا اور اس کے چہرے سے مایوسی ٹپکنے لگتی تھی۔ کبھی کبھی تو اس کی آنکھیں اشکبار بھی ہو جایا کرتی تھیں مگر اس کی یکایک ایسی تبدیلی کوئی بھی سمجھ نہیں پاتا تھا اور یہ سلسلہ تقریباً کئی دہائیوں سے چلا آرہا تھا۔ حالانکہ کئی بار اکرم، وکرم اور رمیش نے اسے کرید کر صداقت کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن ہمیشہ انھیں ناکامی ہی ہاتھ لگی تھی۔ جب کہ وہاں بہت سے ایسے بھی سیاح تھے جنھیں کسی کے ہنسنے یا رونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ انھیں تو بس اپنی مستی سے ہی مطلب تھا۔

ایک مرتبہ تینوں دوست جب اپنے اہل و عیال کے ساتھ پہاڑ پر تفریح کر ہی رہے تھے کہ یکایک وہ لنگڑا فقیر ایک درخت کے نیچے ایک چھوٹے سے پتھر پر بیٹھا ہوا نظر آیا۔ وہ کافی تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ وقت اور حالات کے تھپیڑوں نے اس کے چہرے پر جھریاں ڈال دی تھیں۔

موقع غنیمت سمجھتے ہوئے تینوں دوست اس کے قریب پہنچے اور پیار سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہوئے اس کے دل کو کریدنے کی کوشش بھی کرنے لگے۔ برسوں بعد ایسا پیار پاکر آخر وہ ٹوٹ ہی گیا اور پھر یوں اپنی رودادِ زندگی سنانا شروع کی۔

میرا نام ارمان ہے۔ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے کافی شوخ اور چنچل تھا۔ ضدی بھی اس قدر کہ

ہر حالت میں میری تمام خواہشیں پوری کی جاتی تھیں۔ حالانکہ میرے والدین کوئی زیادہ پیسے والے نہیں تھے۔ بس میں کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا جب کہ میرے اسکول کے کئی دوست اچھے خاصے پیسے والے تھے۔ ان کے لباس، جیب خرچ اور مہنگی مہنگی گاڑیوں کو دیکھ کر من ہی من میں چڑتا رہتا تھا اور ہر حالت میں امیر بننا چاہتا تھا۔

میں اپنی تعلیم پر کم اور پیسے پر زیادہ توجہ دیتا تھا۔ چنانچہ دن بہ دن میری عادت بگڑتی گئی جس سے اکثر میرے والدین نالاں رہتے تھے حالانکہ انھوں نے میری عادت سدھارنے کے لیے کئی بہترین سے بہترین کتابیں بھی خرید کر مجھے دیں مگر میں ان پر بالکل ہی توجہ نہیں دیتا تھا۔ اپنے والد صاحب کی بات رکھنے کے لیے میں نے صرف ایک کتاب پڑھی تھی، جس میں شداد کا واقعہ تھا۔ اگر میں نے اس واقعے پر بھی ایمان داری سے دھیان دیا ہوتا تو شاید سدھر گیا ہوتا۔ لیکن میں نے تو اسے صرف قصے اور کہانیوں کی طرح پڑھ کر چھوڑ دیا تھا حالانکہ وہ واقعہ کافی سبق آموز تھا۔

ایک مرتبہ شداد اپنی ماں کی آغوش میں بیٹھے سمندر کا سفر کر رہا تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد یکایک سمندر میں ایسا طوفان آیا کہ ناؤ کے پرخچے اڑ گئے۔ اس طوفان میں دوسرے مسافروں کی طرح اس کی ماں کی بھی موت ہوگئی اور ایک تختے کے سہارے بہتی ہوئی کنارے جا لگی۔ شداد اپنی ماں کے سینے سے چمٹا ہوا زندہ رہا۔ اگر حق تعالیٰ چاہتا تو اسے بھی وہیں مار دیتا تا کہ سارا جھمیلا ہی ختم ہو جائے مگر وہ سیکڑوں سالوں تک زندہ رہا اور اپنے دور حکومت میں اپنی رعایا پر کافی ظلم و ستم کے پہاڑ بھی توڑا۔ ان کے پیسوں سے دنیا میں ہی اپنے لیے جنت بنوائی اور خدائی کا دعویٰ بھی پیش کیا لیکن بعد میں اس کی کافی عبرت ناک موت ہوئی اور ہر برے و بگڑے ہوئے لوگوں کا اخیر میں انجام بھی برا ہی ہوتا ہے۔

میری بری عادتوں کا اثر سب سے پہلے میرے والد پر ہوا اور وہ خدا کو پیارے ہوگئے۔ ان کے صدمے کی موت سے بھی میں نہیں سدھرا اور لوگوں کی جیبیں کترتا رہا۔ موقع دیکھ کر مال اڑاتا رہا۔ اس طرح ایک شام میں اپنے پاس کے بس

اسٹینڈ کے اردگرد شکار کی تلاش میں چکر لگا ہی رہا تھا کہ میری نظر ایک خاتون پر پڑی جو اپنے دودھ پیتے بچے کے ساتھ ایک کونے میں بنچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ شاید کسی بس کے انتظار میں تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پرس تھا جسے وہ کافی مضبوطی کے ساتھ پکڑے ہوئے تھی اور دوسرے ہاتھ سے اس نے اپنے بچے کو سنبھال رکھا تھا۔ پرس پر نظر پڑتے ہی میں اس کے آس پاس کسی چیل کی طرح منڈلانے لگا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ اندھیرا اپنے پیر پھیلانے لگا... جس کی وجہ سے وہ کافی پریشان لگ رہی تھی۔ میں نے سمجھا کہ پرس میں زیادہ پیسے یا قیمتی سامان ہونے کی وجہ سے وہ اس طرح گھبرائی ہوئی ہے۔ اس لیے میرا تجسس اور بڑھتا گیا۔ اتنے میں اچانک بجلی چلی گئی۔ میں اسے موقع غنیمت سمجھ کر کسی باز کی طرح اس کے پرس پر جھپٹا اور منٹوں میں اسے لے اڑا۔ پھر بھاگتے بھاگتے بار بار پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا کہ کوئی میرا تعاقب تو نہیں کر رہا ہے لیکن اتنے میں، میں ایک تیز رفتار بائک کی زد میں آ گیا اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا کہ میرے ساتھ کیا ہوا۔

مجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ میں کتنے دنوں تک بے ہوش رہا مگر جب میری آنکھ کھلی تو جیسے میری دنیا ہی اجڑ چکی تھی۔ میرا دایاں پیر گھٹنوں تک کاٹ دیا گیا تھا اور بایاں پیر بھی بری طرح زخمی تھا۔ اس حالت میں کئی ہفتے میں سرکاری اسپتال میں پڑا رہا۔ پاس پڑوس والوں سے جب میرے ایکسیڈینٹ کی خبر میری ماں کو ملی تو وہ روتی پیٹتی اسپتال میں پہنچی۔ وہاں پہنچتے ہی ایک نرس نے انھیں سب سے پہلے ایک لیڈیس پرس دیا اور اس کے بعد وہ وارڈ نمبر بتایا جس میں، میں ایڈمٹ تھا۔

انھوں نے سب سے پہلے پرس کھول کر دیکھا۔ اس کے اندر صرف ایک پچاس کا نوٹ تھا۔ روپیہ دیکھتے ہی وہ معاملے کی گہرائی تک پہنچ گئیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ ساون بھادوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں اور مجھ سے ملے بغیر ہی الٹے پاؤں وہاں سے لوٹ کر پتہ نہیں کہاں چلی گئیں۔ میں نے اسپتال سے نکلنے کے بعد اپنے پاس پڑوس والوں سے پوچھا اور بھیک مانگتے ہوئے جگہ جگہ انھیں تلاش کیا بھی۔ مگر افسوس صد افسوس!! وہ کہیں نہیں ملیں... اور آج تک...!!'' اتنا کہتے کہتے وہ زار و قطار رو پڑا۔

پھر چند لمحے کے بعد وہ اپنے بہتے اشکوں کو اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے ہوئے بڑی سمجھداری کے ساتھ کہنے لگا ''آپ لوگ اپنے بچوں سے چاہے جتنا بھی پیار کریں۔ مگر اتنا خیال ضرور رکھیں کہ ہمارے بے جا پیار سے ہمارے بچے بگڑ تو نہیں رہے ہیں کیونکہ کبھی کبھی زیادہ لاڈ و پیار سے بچوں کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ جاتا ہے اور وہ اچھائی یا برائی پر خاص توجہ نہیں دے پاتے... اس طرح غلط راستہ اختیار کرنا ان کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایسی حالت میں اپنے بچوں کو ڈانٹنا اور وقتاً فوقتاً تھوڑا بہت مارنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ جو کہ گلشن میں پھولوں پر آبیاری کی طرح کام کرتا ہے لیکن اتنا دھیان روز رکھیں کہ کبھی کسی بچے پر زیادہ ظلم و زیادتی نہ ہو۔ ورنہ ایسی حالت میں بچوں کے بگڑنے کا امکان اور زیادہ بڑھ جاتا ہے مگر خدا نہ کرے کہ کبھی کوئی بچہ میری طرح بگڑے۔ اتنا کہتے کہتے وہ ایک بار پھر بلک پڑا اور اس کے ساتھ ساتھ تینوں دوستوں کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ جب کہ ان کے بیوی بچے ٹکٹکی باندھے اس لنگڑے فقیر کو دیکھتے رہ گئے۔

■

Gauhar Rafi Shaz
Kanchan Beauty Store
Janta Market, Saudagar Part 1
Kishan Ganj - 855108 (Bihar)

کہانی

بال گھر کی سیر

ثنا اسد

ابّو کا یہ اعلان سن کر سب بچے بہت خوش تھے کہ آئندہ اتوار کو وہ لوگ بال گھر کی سیر کرنے جائیں گے لیکن 8 سالہ شفیقہ کی اس بات پر اپنے 10 سالہ بھائی شفیق احمد سے بحث ہونے لگی کہ بال گھر میں کیا ہے؟ شفیقہ کا خیال تھا کہ بال گھر میں طرح طرح کے رنگین بالوں والی گڑیاں ہوں گی اس لیے بال کی مناسبت سے اُسے بال گھر کہا جاتا ہے لیکن شفیق احمد کا کہنا تھا کہ بال گھر میں کئی قسم کی گیندیں رکھی ہوں گی جیسے فٹ بال، والی بال، کرکٹ بال اور ہاکی بال وغیرہ۔ اسی لیے اس کا نام بال گھر رکھا گیا ہے۔ جب ابّو اور امّی نے دونوں بچوں کی دلچسپ تکرار نما بحث سنی تو وہ ان کے پاس آئے اور دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے ابو نے مسکرا کر کہا۔ ”شفیق میاں آپ کا یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ بال گھر میں طرح طرح کے بال موجود ہیں، اس لیے اسے بال گھر پکارا جاتا ہے۔ شفیقہ بیٹی آپ کی یہ بات بھی درست نہیں ہے کہ وہاں مختلف قسم کے بالوں والی گڑیاں ہیں لہٰذا اُسے بال گھر کا نام دیا گیا ہے۔ دراصل آپ دونوں ہی اس بات کو بھول گئے کہ عام ہندوستانی زبان میں بچے کو بھی بال کہا جاتا ہے۔ بال گھر درحقیقت بچوں کا گھر ہے جس میں بچوں کی دلچسپی کے کئی شعبے ہیں۔ مثال کے طور پر اس میں کھلونا گھر ہے، ٹریفک سینٹر و جھولے ہیں اور گڑیا گھر وغیرہ ہیں۔“

”ابّو! گڑیا گھر اور جھولے وغیرہ سے تو ہم واقف ہیں لیکن یہ ٹریفک سینٹر کیا ہے؟ شفیقہ نے سوال کیا تو ابو نے ان کے سر پر دُلار سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا“۔ آپ جب ہمارے ساتھ کار یا بائک پر کہیں جاتی ہیں تو آپ نے چوراہوں اور تراہوں پر لگی ہوئی ٹریفک لائٹ کے سگنل اور وہاں کھڑے ہوئے سفید وردی والے ٹریفک سپاہی کو ضرور دیکھا ہوگا۔“

”جی ابّو! دیکھا ہے اور ہماری ٹیچر میڈم بھی یہ کہتی ہیں کہ ہم سب کو ٹریفک سگنل اور ٹریفک کنٹرول کے سپاہی کی

ہدایت پر عمل کرنا چاہیے ورنہ حادثہ ہوسکتا ہے اور جان بھی جاسکتی ہے یا ٹریفک کے اصولوں اور قاعدوں کوتوڑنے والا زخمی بھی ہوسکتا ہے۔ ویسے بال گھر کے ٹریفک سینٹر میں کیا بچوں کوسڑک پار کرنے کے اصول اور قاعدے سمجھائے جاتے ہیں؟“

”آپ شفیقہ بیٹی بالکل صحیح سمجھیں۔ ٹریفک سینٹر میں بچوں کو چوراہے اور تراہے حفاظت کے ساتھ پار کرنے کے طریقے عملی طور پر سکھلائے جاتے ہیں۔“ ابّو نے آرام سے اپنی دختر کو بتلایا تو دونوں بچوں نے ایک ساتھ کہا۔”ہم بھی ٹریفک سینٹر میں عملی ٹریننگ لیں گے اور ان پر عمل بھی کریں گے۔“

”بہت اچھی بات ہے۔ مجھے آپ دونوں سے یہی توقع ہے۔“ ابّو نے دونوں بچوں کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا تو شفیق احمد نے آہستہ سے سوال کیا۔”ابّو! پلیز یہ بتلایئے کہ کل اتوار کو ہم سب بال گھر کے لیے کتنے بجے نکلیں گے؟“

شفیق کا سوال سن کر ابّو نے مسکرا کر جواب دیا،”میاں! بال گھر صبح دس بجے کھلتا ہے اور پونے دس بجے سے ٹکٹ کی کھڑکی کے سامنے خریداروں کی قطار لگ جاتی ہے۔ لہٰذا ہم اپنے گھر سے ٹھیک 9 بج کر 20 منٹ پر نکلیں گے اور 8 کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے 9.40 بجے تک بال گھر کے مین گیٹ پہنچ جائیں گے۔ اس لیے آپ دونوں بچے چھٹی کا دن سمجھ کر دیر تک مت سونا بلکہ سویرے ہی اٹھ جانا۔“

”بالکل ابّو! ہم سویرے ہی جاگ جائیں گے اور وقت پر تیار ملیں گے۔“ دونوں بچوں نے وعدہ کیا۔

اگلے روز شفیق احمد اور شفیقہ خانم دونوں صبح جلد ہی اٹھ گئے اور منہ ہاتھ دھو کر اور نہا کر تیار ہو گئے اور 9 بجے ہی ناشتہ بھی کر لیا اور ٹھیک 9 بج کر 20 منٹ پر وہ بال گھر کی سیر کے لیے اپنے مکان سے ابو کے ساتھ نکل گئے۔ شفیق احمد اور شفیقہ بہت مسرور تھے اور بال گھر جلد سے جلد دیکھنے کے لیے بے چین بھی۔ 20 منٹ بعد سب لوگ بال گھر کے مین گیٹ پر پہنچ گئے۔ یہ گیٹ بہت بڑا تھا جس کے دائیں جانب ٹکٹ فروخت کرنے والوں کی ونڈوز (کھڑکیاں) تھیں اور بائیں طرف کاروں اور اسکوٹر وغیرہ کی پارکنگ کے لیے میدان تھا۔ ابّو تو پارکنگ میں کار کھڑی کرنے کے لیے چلے گئے اور شفیق کی امّی سے یہ کہہ گئے کہ وہ لیڈیز (عورتوں کی) ونڈو کے سامنے لگی قطار میں کھڑی ہو جائیں اور دو بڑوں اور دو بچوں کے ٹکٹ خرید لیں۔ اس کے بعد وہ لوگ بال گھر کے احاطہ میں داخل ہوئے تو اندر کی سجاوٹ اور جھولوں وغیرہ کو دیکھ کر شفیقہ اور شفیق بہت مسرور ہوئے۔

ابّو نے کہا”سب سے پہلے ہم گڑیا گھر، کھلونا گھر اور لائبریری دیکھیں گے۔ اس کے بعد جھولوں میں بیٹھیں گے اور پھر لنچ کرنے کے بعد ٹریفک سینٹر کی سیر کریں گے۔ اس لیے گڑیا گھر چلیے۔“ گڑیا گھر کے گیٹ اور دیواروں پر مختلف گڑیوں کی تصاویر اور بُت بنے ہوئے تھے۔ اندر پہنچ کر دونوں بچوں نے قمقموں اور روشنیوں سے جگمگاتے گڑیا گھر کو دیکھ کر خوشی سے تالی بجائی اور ایک بہت بڑی گڑیا کو دیکھنے لگے۔ وہ گڑیا آنکھیں بھی چلاتی تھی اور ہونٹ بھی ہلاتی تھی نیز ہاتھ اٹھا اٹھا کر اور کمر مٹکا کر رقص بھی کرتی تھی۔ شفیق احمد اور شفیقہ خانم کچھ دیر تک اس متحرک بڑی گڑیا کو دیکھتے رہے اور پھر ایک بڑے شوکیس میں رکھی ہوئی رنگ برنگی، چھوٹی بڑی، موٹی پتلی، لمبی وناٹی (چھوٹے قد کی) گڑیوں کو دیکھ کر لطف اٹھاتے رہے۔ شفیقہ نے اپنی پسند کی دو گڑیاں بھی خریدیں۔

گڑیا گھر دیکھنے کے بعد سب لوگ کھلونا گھر میں داخل ہوئے۔ اس گھر کے مین گیٹ اور دیواروں پر طرح طرح کے

کھلونوں کی تصاویر اور بُت بنے ہوئے تھے۔ اندر داخل ہو کر سب نے دیکھا کہ بڑے بڑے شوکیسوں میں مختلف قسم کے چھوٹے بڑے اور نئی پرانی ڈیزائن کے کھلونے رکھے ہوئے تھے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ زیادہ تر کھلونے وطن عزیز یعنی ہندوستان میں ہی بنے ہوئے تھے، کچھ کھلونے غیر ممالک سے بھی لائے گئے تھے۔ شفیق میاں کو یاد آیا کہ ان کی کلاس ٹیچر سلمہ بیگم نے کلاس میں بچوں کو سمجھایا تھا کہ سودیشی یعنی اپنے دیس میں بنی ہوئی چیزوں کو ہی ہمیں خریدنا چاہیے کیونکہ ایسا کرنے سے ہندوستان ترقی کرتا ہے۔ لہٰذا شفیق احمد نے پانچ اور شفیقہ نے تین کھلونے اپنی اپنی پسند سے خریدے لیکن وہ سب ہندوستان میں ہی بنے ہوئے تھے۔ کھلونا گھر سے باہر آنے کے بعد سب جھولوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے چل پڑے۔

بال گھر میں کئی قسم کے چھوٹے بڑے، لمبے چوڑے اور گول جھولے لگے ہوئے تھے، کوئی سانپ سیڑھی کی طرح اوپر جاتا اور پھر نیچے کی طرف مڑ جاتا تھا تو کوئی ہنڈولا تھا اور کوئی چرخی کی طرح دائرہ میں گھومتا تھا۔ شفیق احمد ہنڈولے میں جھولنا چاہتے تھے تو شفیقہ خانم کو سانپ سیڑھی جیسا جھولا پسند تھا۔ اس لیے ابّو نے یہ فیصلہ کیا کہ شفیق اپنی امّی کے ساتھ ہنڈولے میں اور شفیقہ اپنے ابّو کے ساتھ سانپ سیڑھی جیسے جھولے میں جھولنے کا لطف اٹھائیں گے۔ اس فیصلے سے دونوں بچے مطمئن اور مسرور تھے۔ مسکراتے ہوئے دونوں بچے اپنی اپنی پسند کے جھولوں میں بیٹھ گئے اور 20 منٹ تک جھولتے رہے۔ جھولنے کے بعد سب لوگ کینٹین میں میز کرسیوں پر بیٹھ گئے اور لنچ کرنے لگے۔ کھانے کے بعد جہاں بچوں نے کولڈ ڈرنکس لیں اور ابو امی نے چائے پی۔ کھانے پینے سے نمٹنے کے بعد ابو سب کو بال گھر کی لائبریری میں لے گئے جہاں بچوں کے لیے دلچسپ اور تصویری کتابیں اور رسالے موجود تھے۔ وہیں ڈیجیٹل بکس بھی تھے جبکہ بہت سی کتابیں اور رسائل برائے فروخت بھی تھے۔ دونوں بچوں کو یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ وہاں انگریزی اور ہندی کی کتب اور رسائل کے ساتھ ساتھ اردو کی کتابیں اور ماہنامہ 'بچوں کی دنیا'، ماہ

نامہ 'امنگ' اور ماہ نامہ 'باغیچہ' جیسے اردو کے رسالے بھی رکھے ہوئے تھے۔ شفیق احمد اور شفیقہ خانم نے جہاں اپنی پسند کی کتابیں خریدیں، وہیں وہ دو اردو رسائل کے سالانہ خریدار بھی بن گئے۔

سب سے آخر میں ابّو سب کو ٹریفک سینٹر میں لے گئے جو ایک بڑے میدان میں واقع تھا اور جہاں سڑکیں، تراہے اور چوراہے بنے ہوئے تھے جن پر ریڈ لائٹ یعنی ٹریفک کو کنٹرول کرنے کے لیے بتیاں لگی ہوئی تھیں جو کبھی لال، پیلی اور کبھی ہری ہو جاتی تھیں۔ چوراہوں اور تراہوں پر سفید وردی پہنے ہوئے ٹریفک کو کنٹرول کرنے والے سپاہی بھی کھڑے تھے۔ کچھ بچے اپنی سائیکل، ٹرائی سائیکل یعنی چھوٹی رکشہ اور کھلونا کاروں پر سوار بھی تھے اور چوراہے کی لال بتّی دیکھ کر رُکے ہوئے تھے۔ ٹریفک پولیس والا انھیں سمجھا رہا تھا۔ ''پیارے بچو! جب یلو لائٹ یعنی پیلی بتّی ہو تو رکنے کے لیے تیار ہو جاؤ اور جب ریڈ یعنی لال بتّی ہو جائے تو فوراً اپنی گاڑی کو بریک لگا کر روک دو مگر گرین یعنی ہری بتّی ہونے پر اپنی گاڑی کو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھو اور کوشش کرو کہ لال بتّی ہونے سے پہلے ہی چوراہا یا تراہا پار کر لو۔'' ٹریفک والے سپاہی نے مزید سمجھایا کہ ''بجلی نہ ہونے کی صورت میں بتّی نہیں جلتی۔ اس لیے تب چوراہے یا تراہے پر تعینات ٹریفک پولیس والے ہاتھ کے اشارے (سپاہی ہاتھ اٹھا کر رکنے کا اشارہ کرتا ہے) سے ٹریفک کو روکتے ہیں۔ ان کے رکنے کے اشارے کو دیکھ کر رکنا چاہیے اور جب وہ ہاتھ ہلا کر آگے بڑھنے کا اشارہ کریں تو آگے بڑھنا چاہیے۔ جو لوگ ٹریفک کے قاعدے قانون پر عمل کرتے ہیں وہ محفوظ رہتے ہیں لیکن جو قانون کو توڑتے ہیں وہ اپنے اور دوسروں کے جسم بھی توڑ سکتے ہیں اور کبھی کبھی ہلاک بھی ہو جاتے ہیں۔'' یہ سن کر شفیق نے بھی سائیکل لی اور چوراہے پر لال بتّی دیکھ کر وہ رک گئے اور ہری بتّی ہونے پر انھوں نے چوراہا پار کیا۔ اس طرح انھوں نے اور دیگر بچوں نے ٹریفک کے قاعدے قانون عملی طور پر سیکھے۔

چونکہ بال گھر شام آٹھ بجے بند ہو جاتا ہے۔ لٰہذا ابّو نے کہا ''ہمیں پونے آٹھ بجے ہی بال گھر سے باہر نکل جانا چاہیے کیونکہ آٹھ بجے بہت بھیڑ ہو جاتی ہے۔'' یہ سن کر دونوں بچے اپنے ابو اور امی کے ساتھ ٹھیک پونے آٹھ بجے بال گھر سے باہر آ گئے۔ امّی نے جب اپنے بچوں سے دریافت کیا ''بال گھر کی سیر آپ دونوں کو کیسی لگی؟'' تو شفیقہ اور شفیق دونوں نے اچھلتے ہوئے کہا ''بہت اچھی!'' اور یہ کہہ کر سب لوگ کار میں سوار ہو گئے۔

■

Sana Asad
21/37 3 ec Rood
Dehradun 248001 (Uttrakhand)

فوزیہ خانم عبدالرحمن خان

انسانیت اور خودنمائی

کسی شہر میں ایک آفسر کی فیملی رہتی تھی۔ وہ دن رات اپنے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔

ہر روز کی طرح اختر صاحب کا بیٹا اطہر اپنے آفس سے آ رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ سڑک کے کنارے ایک آدمی کا ایکسڈنٹ ہو گیا ہے اور وہاں بہت بھیڑ جمع ہے تو اس نے اس بات پر غور کیا کہ وہ انسان زندگی اور موت کے بیچ جھول رہا ہے۔ بجائے اس کے کہ لوگ اسے اسپتال لے جاتے، لوگ اس کی ویڈیو بنا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ میڈیا والے بھی اس کی ویڈیو بنا رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر اطہر کو بہت غصہ آیا۔ وہ اپنی گاڑی سے اترا اور سب کو بہت باتیں سنائیں۔ اطہر نے اس آدمی کو اٹھایا اور اپنی گاڑی میں ڈال کر اسپتال پہنچایا۔ وہاں پہنچ کر سب کچھ ڈاکٹر کو بتایا۔ وہاں کے مشہور ڈاکٹر عرفان نے خبر دی کہ ان کی طبیعت بہت ہی نازک ہے۔ انھیں فوراً Emergency ward میں داخل کرنا پڑے گا اور اس کے لیے ابھی اور اسی وقت 50,000 کی ضرورت ہے۔ اطہر نے اپنے والد اختر صاحب کو فون کیا اور ساری تفصیلات سنائی اور پیسے لے کر اسپتال بلایا۔ تھوڑی دیر کے بعد اطہر صاحب پیسے لے کر اسپتال پہنچے۔ چند گھنٹوں بعد اس آدمی کو ہوش آنا شروع ہوا تو اس کو Normal ward میں شفٹ کیا گیا۔ اس آدمی سے اطہر صاحب نے پوچھا کہ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ تو اس آدمی نے دھیرے سے ہاں ''ٹھیک ہے'' کہا۔ پھر اطہر نے پوچھا آپ کون ہیں؟ اس شہر میں آپ کا کوئی رشتے دار ہے؟ تو اس آدمی نے آنکھوں کے اشارے سے نہیں کہہ دیا۔ ڈاکٹر نے اس کی حالت دیکھ کر کہا کہ تم اب مریض سے بات

نہیں کر سکتے۔ مریض بہت ہی نازک Condition میں ہے۔ اطہر اور اس کے والد کو اسپتال میں رات کے 9:00 بج چکے تھے۔ 9:05 کو اس آدمی کے موبائیل پر ایک فون آیا۔ اطہر کو فون پر ایک چھوٹے سے بچے کی آواز آئی تو اطہر نے پوچھا۔ بیٹا آپ کون ہیں؟ تو اس بچے نے کہا یہ نمبر میرے والد کا ہے۔ وہ کہاں ہے؟ اطہر نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ اطہر نے اس بچے کا پتہ پوچھا اور اسے لینے کے لیے اس کے گھر گیا۔ اطہر نے دروازے پر دستک دی تو بچے نے دروازہ کھولا۔ بچے نے روتے ہوئے پوچھا آپ کون ہیں؟ تو اطہر نے کہا بیٹا میں تمھیں لینے آیا ہوں تمھارے والد سے ملانے کے لیے۔ بچہ بہت ڈرا ہوا تھا وہ ہمت کر کے اطہر کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اطہر اور بچہ دونوں اسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ بچے کی حالت دیکھ کر اطہر کو بہت دکھ ہوا۔ اطہر نے بچے سے پوچھا بیٹا تمھاری عمر کیا ہے؟ بچے نے بڑی معصومیت سے کہا کہ میری عمر 11 سال کی ہے۔ اطہر نے پھر پوچھا کہ تمھارے گھر پر اور کون کون لوگ ہیں؟ تو بچے نے جواب دیا میں اور میرے والد۔ آج سے دو سال پہلے میری امی اللہ کو پیاری ہوگئی۔ اتنا کہہ کر بچے نے پھر رونا شروع کر دیا اور روتے ہوئے ہی والد کا حال پوچھا کہ میرے والد کب تک ٹھیک ہوجائیں گے؟ کیا ان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے؟ اطہر نے اس بچے کو سمجھاتے ہوئے کہا، تمھارے والد بالکل ٹھیک ہیں بس تھوڑی سی چوٹ آئی ہے۔ ایک دو روز اسپتال میں رہیں گے اور پھر تمھارے ساتھ گھر پر آجائیں گے۔ تم بس ان کی مکمل صحت یابی کی دعا کرو۔ اطہر اور بچہ دونوں اسپتال پہنچ گئے۔ اطہر کے والد کو بچے پر بہت رحم اور ترس آیا۔ اطہر کے والد نے بچے سے نام پوچھا؟ بچے نے اپنا نام علی بتایا۔ پھر اختر صاحب نے کہا،

اچھا تم ہی علی ہو۔ بیٹا تم نے کچھ کھایا؟ جی نہیں، میں اور میرے والد روز ساتھ میں کھانا کھاتے ہیں، اس لیے میں ان کا انتظار کر رہا تھا۔ اطہر کے والد سامنے کے مشہور Aafiya Hotel سے کھانا منگوایا تو اس بچے نے کھانے سے انکار کر دیا اور کہا مجھے میرے والد سے ملنا ہے۔ اطہر کے والد نے بچے کو سمجھایا اور کہا کہ بیٹا تم اب صبح ہی مل سکتے ہو، اب تم کھانا کھالو۔ بچے نے بہت اصرار کرنے پر تھوڑا سا کھانا کھایا۔ اطہر اس بچے کو اپنے گھر لے گیا اور اطہر کے والد اسپتال ہی میں رک گئے۔ اطہر گھر پہنچا تب تک سب سو چکے تھے۔ اطہر اس بچے کو کمرے میں لے گیا وہ کمرہ اطہر کا تھا۔ اطہر نے اس بچے کو سونے کے لیے کہا تو اس بچے نے کہا کہ میں اکیلا اس کمرے میں نہیں سو سکتا مجھے عادت نہیں ہے۔ اطہر نے کہا ٹھیک ہے میں تمھارے پاس سو جاؤں گا۔ اور وہ دونوں سو گئے۔ صبح ہوتے ہی بچے نے فجر کی نماز ادا کی اور رو کر اس کے والد کی طبیعت کے لیے دعا کر رہا تھا کہ اس کی رونے کی تھوڑی تھوڑی آواز سے اطہر کی آنکھ کھل گئی۔

اطہر یہ سب دیکھ کر بہت حیران ہوا پھر اس بچے کو سمجھایا اور اس کے گھر والوں سے ملاقات کروائی بچے کو دیکھ کر سب کو اس پر بہت رحم آیا انھوں نے اس بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اطہر نے بتایا اس بچے کا نام علی ہے پھر اطہر اور علی نے ناشتہ کیا اور اسپتال میں بھی ناشتہ لے گئے۔ اطہر کے والد نے بتایا کہ علی کے والد تھوڑی دیر پہلے سے مکمل ہوش میں آ چکے ہیں۔ علی بہت خوش ہوا۔ علی نے کہا اے خدا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔

تب ہی اطہر کے والد نے کہا کہ بیٹا تمھیں تمھارے والد بہت یاد کر رہے تھے۔ علی نے کہا مجھے میرے والد سے ملوا دو۔ علی نے جب اپنے اپنے والد کو دیکھا تو گلے سے لپٹ کر بہت رویا اور اس کے والد بھی بہت رو رہے تھے یہ دیکھ کر اطہر اور اس کے والد بھی رو پڑے انھوں نے ڈاکٹر سے کھانا کھلانے کی بات کی تو ڈاکٹر نے اجازت دے دی پھر علی نے اپنے والد کو اپنے ہاتھ سے ناشتہ کرایا۔ علی کے والد نے پوچھا آپ کون ہیں؟ آپ نے بہت بڑا احسان کیا ہے؟ مجھ پر اور میرے بیٹے پر آپ کا احسان ہم زندگی بھر نہیں بھول سکتے۔ اطہر کے والد نے کہا کہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ ہم نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا یہ ہمارا فرض تھا۔ جو ہم نے پورا کیا۔ آپ اس کو احسان کا نام دے کر ضائع مت کرو اور ہمیں بھی شرمندہ مت کرو۔ علی نے سارا قصہ اپنے والد کو سنایا اور والد نے اطہر صاحب کی پوری فیملی کو دعا دی۔ علی کے والد کی طبیعت دو دن کے بعد normal ہو چکی تھی۔ اس لیے وہ discharge بھی ہو چکے تھے۔

اطہر کے والد علی کے والد کو اپنے گھر لے آئے اور سب سے ملوایا، سب ان سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ اطہر کے والد نے ان دونوں کو اپنے گھر رکھ لیا۔ دونوں نے بہت انکار کیا مگر اختر صاحب کی ضد نے انھیں روک لیا اور اختر صاحب نے اپنے آفس میں انھیں نوکری دے دی اور علی کو سب گھر والوں نے بہت پیار دیا۔ علی ان کے گھر میں سب سے بہت اچھی طرح گھل مل گیا تھا۔ انھوں نے علی کو پڑھایا اور ایک اچھا آفیسر بنایا۔ علی کو آفیسر بن کر بڑا آدمی بنتا ہوا اس کے والد نے دیکھا تو خوشی سے علی کے والد کی آنکھوں میں آنسوں آ گئے۔ انھوں نے اختر صاحب کو بہت دعائیں دی۔

■

Fauzia Khanam Abdur Rahman
Room No: 3, Mastar Colony, Mehroon
Jalgaon- 425001 (Maharashtra)

محاورے

پیارے بچو! زبان میں محاورے کی بڑی اہمیت ہے۔ اس سے بیان میں بڑی قوت پیدا ہوتی ہے، اسی لیے اہل زبان اور معتبر شعرا معیاری محاوروں کا اپنی شاعری اور تحریر میں استعمال کرتے ہیں۔ محاوروں سے ہی کسی بھی قوم، ملک کی تہذیب کا اندازہ ہوتا ہے۔ قدیم زبان میں محاوروں کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ آپ بھی اپنی زبان و بیان کو بہتر اور پراثر بنانا چاہتے ہیں تو محاوروں پر لکھی کتابوں کو اپنے مطالعے کا حصہ ضرور بنائیں۔ اردو میں ایسی بہت سی کتابیں مل جائیں گی۔ آپ وارث سرہندی کی 'جامع الامثال'، مقبول الٰہی کی 'اردو میں مستعمل عربی و فارسی ضرب الامثال'، محمد رمضان عبدالشکور کی 'شعری جواہرات اور ضرب الامثال' اور دیگر کتابوں سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

ایسے گئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ: یعنی بالکل معدوم ہوگئے۔

ایسے لڑکے بہت کھلائے ہیں: ہم پھسلانے میں آنے والے نہیں ہیں۔

ایک انار سو بیمار: ایک چیز کے طلب گار بہت ہیں۔

ایک انڈا وہ بھی گندا: اکلوتے نا خلف بچے کی نسبت بولتے ہیں۔

ایک اینٹ کے لیے مسجد ڈھانا: تھوڑے نفع کے لیے نقصان عظیم گوارا کرنا۔

اوکھلی میں دیا سر تو موسل سے کیا ڈرنا: جب خطرناک کام اختیار کیا تو مصیبت سے کیا ڈرنا۔

ایک آنکھ نہ بھانا: بالکل پسند نہ آنا۔

ایک رنگ آنا ایک رنگ جانا: چہرے کا رنگ اڑنا، خوف یا دہشت سے ہراساں ہونا۔

ایک مچھلی سارے جل کو گندا کرتی ہے: ایک شخص کے برا ہونے سے ساری قوم کی بدنامی ہوتی ہے۔

ایک تھیلی کے چٹے بٹے: ایک ہی طرح کا مزاج رکھنے والے۔

ایک لاٹھی سے سب کو ہانکنا: ایک ہی حکم سب پر جاری کرنا۔

بات کا بتنگڑ ہوگیا: ذرا سی بات، بہت بڑھ گئی۔

باپ پر پوت پرا پت گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا: خاندانی مزاج ضرور رنگ لاتا ہے۔

باسی بچے نہ کتا کھائے: جو ملے سو کھالو۔

باؤلا کتا ہرن کھدیڑے: اپنی طاقت سے زیادہ حوصلہ کرنا۔

بال کی کھال ہندی کی چندی: کسی بات کی بہت تحقیق کرنا۔

بد اچھا بدنام برا: رسوا ہونا بدکاری سے بھی زیادہ برا ہے۔

بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا: چیز اپنے پاس ہو اور ڈھونڈتے پھریں ادھر اُدھر۔

بکری کی ماں کب تک خیر منائے گی: جو آفت اور مصیبت مقدر میں ہے وہ آ کر رہتی ہے۔

بلی کے خواب میں چھیچھڑے: جیسا آدمی ویسے میں خیالات، آدمی اپنی دھن میں رہتا ہے۔

بند مٹھی لاکھ کی کھلے تو خاک کی: راز فاش کر کے آدمی بے عزت ہوتا ہے۔

بن مانگے ماں بھی بچے کو دودھ نہیں دیتی: بغیر کوشش کام نہیں ہوتا، سوال کیے سے کچھ ملتا ہے۔

بویا گیہوں اُپجا جو: بھلائی کے بدلے برائی ملنا۔

بھان متی نے کنبہ جوڑا کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا: واہی تباہی لوگوں کے مجمع کی نسبت بولتے ہیں۔

بھوکے بھجن نہ ہوئے: خالی پیٹ کوئی کام نہیں ہوتا

بھینس کے آگے بین بجائے بھینس کھڑی پگرائے: بیوقوف کو ہنر دکھانا بیکار ہے۔

بڑے شہر کا بڑا چاند: بڑے آدمی کی ہر بات بڑی سمجھی جاتی ہے۔

پاپڑ بیلنا: محنت اور مشقت کرنا، مصیبت پیٹنا۔

■

ماخذ: دہلی کے محاورے: سید ضمیر حسن دہلوی، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، سنہ اشاعت: 2008

ستیہ گپتا، مترجم: شمیم نکہت

بیماریوں سے تحفظ

صحت ہی زندگی ہے، یہ مہاتما گاندھی نے کہا تھا۔ کچھ اسی طرح کی بات اردو کے ایک شاعر نے بھی کہی ہے:

تنگ دستی اگر نہ ہو سالک تندرستی ہزار نعمت ہے

صحت اور تندرستی زندگی کے لیے بہت لازمی ہیں۔ ذہنی صحت کے لیے جسمانی صحت کی ضرورت پڑتی ہے اسی لیے اگر شروع سے ہی صحت اور تندرستی کے تعلق سے لاپرواہی کے بجائے بیداری کا رویہ اختیار کیا جائے تو انسان بہت ساری بیماریوں سے بچ سکتا ہے۔ ہمارے عہد میں بچوں کی صحت ایک بڑا مسئلہ ہے، اس پر سنجیدگی سے توجہ دیے جانے کی ضرورت ہے۔ بچوں کی صحت کے تعلق سے 'بچوں کی دنیا' میں یہ کالم اس لیے شروع کیا گیا ہے تاکہ والدین کے ساتھ ساتھ بچے خود بھی اپنی صحت اور تندرستی کا خیال رکھ سکیں۔

پولیو سے بچے کو محفوظ کرنے کے بارے میں کچھ بتائیں؟

پولیو کے قطرے اس عمر میں دینا چاہئیں جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی ویکسین (Vaccine) کے چند قطرے بچے کے منہ میں ٹپکا دیے جاتے ہیں لیکن اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ بچے کو دوا دینے سے آدھا گھنٹہ پہلے اور آدھا گھنٹہ بعد کچھ نہ کھلایا جائے۔ اس بات کا بھی اطمینان کر لینا چاہیے کہ پولیو کی دوا دیتے وقت بچے کو ڈائریا، سانس کی شکایت، نزلہ زکام نہ ہو ورنہ دوا سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ دوا کسی باضابطہ تسلیم شدہ مرکز سے حاصل کی جائے ورنہ ہوسکتا ہے کہ آپ کو نقلی یا خراب ویکسین مل جائے جس کے نتائج بعد میں خراب نکل سکتے ہیں۔ اگر دوا ٹھیک طریقہ سے نہ دی جائے تو اس کا اثر نہیں ہوتا۔ اس دوا کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے ریفریجریٹر میں ایک خاص درجۂ حرارت پر ٹھنڈ رکھنا پڑتا ہے۔ اکثر مرکزوں میں اس کی سہولت مہیا نہیں ہوتی۔ اس لیے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے کہ دوا وہیں سے حاصل کی جائے جہاں یہ سہولت موجود ہو۔ پولیو کے قطرے پہلے یا زیادہ سے زیادہ بوسٹر کے بعد دینے کی ضرورت نہیں رہتی۔

بچہ کو ہیضہ اور میعادی بخار سے کیسے بچائیں؟

بچہ کو ٹائیفائڈ کا ٹیکہ ہر سال گرمی شروع ہونے سے پہلے لگوانا چاہیے کیونکہ اس ٹیکے کی میعاد چھ ماہ ہوتی ہے۔ بچوں کو آپ ہر جگہ اور ہر قسم کا پانی پینے سے کہاں تک روک سکتے ہیں۔ اگر آپ اسے بوتل میں پانی بھر کر دے دیں تب بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ یا تو یہ پانی دوسرے بچوں کو پلا دے گا یا پھینک دے گا اور دوسرے بچوں کے ساتھ اسکول کے نل سے پانی پیے گا تاکہ اسے کوئی 'نکّو' نہ بنا سکے۔ اس کے علاوہ دودھ

اور آئس کریم سے بھی ٹائیفائڈ کے جراثیم پھیلتے ہیں۔ بچے آئس کریم کے شوقین ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ اچھا ہے کہ انھیں آئس کریم کھانے سے روکنے کے بجائے ٹائیفائڈ کا ٹیکہ لگا دیا جائے۔

ہیضہ کا ٹیکہ بچوں کو لگانا اصولاً صحیح اور مناسب نہیں ہے۔

کیا بی۔سی۔جی کے ٹیکے کا اعادہ بھی ضروری ہے؟

اگر بچے کو بی۔سی۔جی دیا گیا ہے تو ایک سال کی عمر میں اس کی جانچ کرنا چاہیے کہ ٹیکہ کامیاب رہا یا نہیں۔ اس جانچ کو (Mantoux) کہتے ہیں۔ اگر جانچ کا نتیجہ منفی نکلے تو ٹیکہ دوبارہ لگوانا چاہیے۔ اگر نتیجہ مثبت ہے تو ٹیکہ دوبارہ لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

ایم ایم آر ویکسین کے متعلق کچھ بتائیے؟

ایم ایم آر ویکسین، خسرہ، گلسوئے (Mumps) اور روبیلا یا جرمن میزل سے تحفظ کے لیے ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں صرف خسرہ کی ویکسین ملتی ہے وہ بھی چند جگہوں پر۔ بقیہ دو قسم کی ویکسین ہندوستان میں موجود نہیں ہے۔ بیرونی ممالک میں یہ ویکسین نہ صرف موجود ہے بلکہ بہت ارزاں بھی ہے۔ اسے یہاں استعمال کے لیے درآمد کرنا بھی ممکن نہیں ہے لیکن جب یہ ہمارے ملک میں تیار ہونے لگے تو اسے ضرور استعمال کیا جائے کیونکہ یہ ایک ہی وقت میں بچے کو تین موذی بیماریوں سے محفوظ کر دیتی ہے۔

روبیلا کی بیماری کیا ہے اور یہ حاملہ عورتوں کے لیے کیوں خطرناک ہے؟

روبیلا ایک قسم کا خسرہ ہے لیکن یہ خسرہ کے مقابلہ میں کم شدید ہوتا ہے۔ اس بیماری میں مبتلا شخص کی گردن میں گلٹیاں نکل آتی ہیں جو خسرہ کے مریض کو نہیں نکلتیں۔ اگر کسی چھوٹی بچی کو روبیلا ہو جائے تو پھر وہ ایک لمبے عرصہ تک اس بیماری میں مبتلا نہیں ہوتی لیکن اگر کسی حاملہ عورت کو، خصوصاً حمل کے پہلے تین مہینوں میں، یہ بیماری ہو جائے تو یہ پیٹ کے بچے کو بھی لگ جاتی ہے جس کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ وہ بچہ اندھا پیدا ہو یا اس کے جسم میں کوئی اور عیب پیدا ہو جائے اور اپاہج ہو جائے۔ اسی لیے ہم یہ مشورہ دیتے ہیں کہ روبیلا کا ٹیکہ بچپن ہی میں لگوا لینا چاہیے تاکہ بچہ اس مرض سے محفوظ رہ سکے۔ ایسی حاملہ عورت جو بچپن میں روبیلا میں مبتلا رہ چکی ہو یا جس کا ٹیکہ لگ چکا ہو نہ تو حمل کے دوران اس بیماری میں مبتلا ہوگی اور نہ یہ بیماری پیٹ کے بچے کو لگ سکے گی۔

کیا ٹیکے بیماریوں سے سو فیصد محفوظ کر دیتے ہیں؟

ہوسکتا ہے کہ ٹیکوں سے بیماریوں سے سو فیصد تحفظ نہ ہوتا ہو لیکن ان میں سے اکثر بیماریوں سے نوے فیصدی تحفظ تو ہو ہی جاتا ہے۔ نوے فیصدی میں نے اس لیے کہا کہ ہوسکتا ہے کہ جب اس کو ٹیکہ لگا ہو تو بیماری کے جراثیم اس کے بدن میں موجود ہوں۔ بہرحال اگر ٹیکہ لگنے کے بعد بیماری ہوتی بھی ہے تو بہت ہلکی ہوتی ہے اور اس کا بچہ کی صحت پر برا اثر نہیں ہوتا اور اگر بچے ابتدا ہی میں ٹیکے لگوا دیے جائیں تو بیماری سے سو فیصدی محفوظ رہ سکتا ہے۔ پولیو کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ٹیکے کے بعد بھی ہو جاتا ہے لیکن یہ غلط ہے۔ اگر ویکسین صحیح ہو اور ٹھیک طریقے سے دی جائے تو بچے کو پولیو نہیں ہوتا۔ بدقسمتی سے ابھی بعض امراض کے خاتمہ کے لیے کوئی دوا تیار نہیں ہوسکی ہے لیکن جو دوائیں مہیا ہیں ان کے ٹیکے ضرور بچے کو دے دینا چاہئیں۔

■

ماخذ: بچے کی صحت، **مصنف:** ستیہ گپتا، **مترجم:** شمیم نکہت، **سنہ اشاعت:** چوتھی طباعت: 2010، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

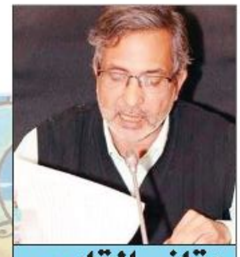

حقانی القاسمی

ایک کوشش

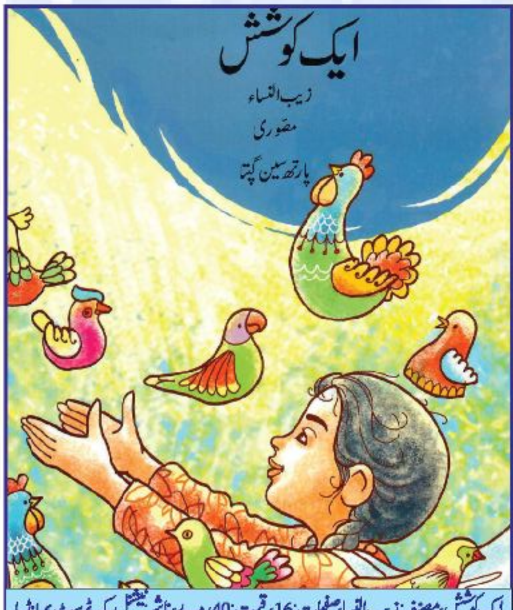

ایک کوشش، مصنفہ: زیب النسا، صفحات: 16، قیمت: 40 روپے، ناشر: نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

بچوں کا اپنا الگ سنسار ہوتا ہے، ان کی کائنات بڑوں سے بڑی مختلف ہوتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں سے سجی ہوئی یہ کائنات بڑی خوبصورت لگتی ہے۔ بچے کہانیوں میں وہی کائنات تلاش کرتے ہیں جس میں تھوڑا تجسس ہوتا ہے، تھوڑا تحیر، تھوڑی شوخی ہوتی ہے اور تھوڑی شرارت بھی۔ انھیں چرند پرند سے بھی بڑی دلچسپی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں کے اکثر کردار طوطا، مینا، گائے، گوریا، بکری، بلی وغیرہ ہوتے ہیں اور شاید چرند و پرند سے اسی دلچسپی کی وجہ سے شاعروں اور ادیبوں نے چرند و پرند پر نظمیں اور کہانیاں بھی لکھی ہیں لیکن بدلتے وقت کے ساتھ اب ہمارے بچوں کی ذہنی ترجیحات بھی تبدیل ہوتی جارہی ہیں۔ نئی ٹیکنالوجی نے ان کو پورے طور پر طلسم میں گرفتار کرلیا ہے۔ اسی لیے بچوں کو کارٹون وغیرہ سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے مگر آج بھی کچھ کہانیاں، کارٹون کی طرح بچوں کو بہت دل چسپ لگتی ہیں، زیب النسا نے بھی کچھ ایسی پر تاثیر کہانیاں لکھی ہیں۔

وہ بچوں کی معروف ادیبہ ہیں۔ ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھتی ہیں۔ کئی اہم اشاعتی اداروں سے بچوں کے لیے لکھی گئی ان کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا جیسے معتبر اشاعتی ادارے نے پارتھ سین گپتا کی خوبصورت مصوری کے ساتھ ان کی ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے 'ایک کوشش'۔ یہ ایک کہانی ہے بڑی دلچسپ ہے اور مصنفہ نے اپنے خوبصورت، سادہ، سلیس زبان و بیان سے اسے اور بھی زیادہ خوبصورت بنا دیا ہے۔

کہانی کا کردار غریب مگر نیک لڑکی ام ہانی ہے۔ پوری کہانی ام ہانی اور ایک ایسی چڑیا کے ارد گرد گھومتی ہے جس سے اس لڑکی کو محبت ہو جاتی ہے کہ دراصل وہ چڑیا نہیں، اس کی حقیقی معنوں میں دوست اور مشیر ہے جو اس کی منفی سوچ کے زاویے کو بدل دیتی ہے اور اس کی اداسیوں کو مسرتوں میں تبدیل کر دیتی ہے اور زندگی کا ایک خوبصورت سبق سکھا جاتی ہے۔

ام ہانی گاؤں میں لگنے والے میلے میں گھومنے کے لیے جانا چاہتی ہے مگر غریب ہونے کی وجہ سے ماں منع کر دیتی ہے۔ تبھی جب ماں کسی کام پر جاتی ہے تو ام ہانی نیم کے پیڑ کے نیچے سوچنے لگتی ہے کہ ''مجھے مٹی کے رنگ برنگے کھلونے خریدنے تھے، ماں تو جانتی ہے کہ مجھے کھلونے بہت پسند ہیں

پھر بھی میلے میں نہیں گئی، کاش ہم غریب نہ ہوتے۔"

اسی غربت کے احساس کو کہانی میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ چھوٹی سی بچی یہ سوچنے لگتی ہے کہ غربت کی وجہ سے ہی آج وہ اپنی مسرتوں، خواہشوں اور خوابوں کی تکمیل سے محروم ہے۔ تبھی ایک بھوکی چڑیا اسے نظر آتی ہے تو وہ چاول کے دانے پیڑ کے نیچے ڈال دیتی ہے۔ چڑیا چاول کے دانے دیکھ کر خوش ہوجاتی ہے اور وہ اپنے ننھے منے بچوں کو کھلانے کے لیے اپنے گھونسلے میں جا پہنچتی ہے۔ یہ منظر بہت ہی خوبصورت ہوتا ہے۔ چڑیا کی یہ حرکت دیکھ کر ام ہانی سوچنے لگتی ہے "میری ماں بھی تو اسی چڑیے کی طرح میری خاطر محنت مزدوری کر رہی ہے"

ام ہانی کی آنکھیں بھر آتی ہیں تبھی اس چڑیا کی آواز اسے سنائی دیتی ہے کہ "میں جانتی ہوں کہ تم دکھی کیوں ہو اس لیے نا کہ تم میلہ دیکھنے نہیں جا پائیں؟ میں یہ بھی اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم میلے سے کیا خرید کر لاتیں۔"

کہانی آگے بڑھتی ہے۔ چڑیا اسے دلاسہ دیتی ہے اور اسے یہ بات بتاتی ہے کہ ایک ہی راستہ ہے جس سے تمھاری ساری خواہشیں پوری ہوسکتی ہیں اور تم کامیابی کی منزلیں طے کرسکتی ہو۔ وہ کہتی ہے کہ "میں تمھیں ایک بات کہوں جسے ہمیشہ یاد رکھنا کہ انسان کی سب سے اچھی دوست اس کی دس انگلیاں ہیں۔" اور پھر وہ کمہار کے یہاں سے مٹی اور رنگ لانے کا مشورہ دیتی ہے۔ وہ لڑکی مٹی اور رنگ لا کر اسی طرح چڑیا بناتی ہے اور خوش ہوجاتی ہے۔ ماں بھی اس کی بنائی ہوئی چڑیا دیکھ کر خوش ہوتی ہے اور پھر کہتی ہے کہ "سچی لگن کو کانٹوں کی پرواہ نہیں ہوتی۔ آج میں نے جان لیا کہ تمھارے اندر غضب کی صلاحیت چھپی ہوئی ہے۔"

چڑیا اسے بتاتی ہے کہ "رب کی کائنات بھی بڑی نرالی ہے۔ شاید تم نہیں جانتیں کہ اس کائنات میں کئی ایسی حسین وادیاں ہیں جہاں بہت ہی خوبصورت اور رنگ برنگے چرند و پرند رہتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ تم انہی پرندوں جیسی چڑیا بناؤ اور انھیں خوبصورت رنگوں سے سجاؤ۔ گھبرانا نہیں میں تمھاری مدد کروں گی۔"

اس طرح کہانی آگے بڑھتی ہے اور ایک دن ایسا ہوتا ہے کہ چڑیا کا آشیانہ بکھر جاتا ہے تو ام ہانی اسے اپنے گھر میں رہنے کا مشورہ دیتی ہے مگر چڑیا کہتی ہے کہ تمھارا اور میرا ساتھ بس اتنا ہی تھا۔ چڑیا کے جانے کے بعد ام ہانی اپنے ہاتھ سے مٹی گوندھتی ہے اور ان گنت کھلونے بناتی ہے جن میں سب سے زیادہ چڑیا ہی ہوتی ہیں۔ اس طرح وہ اپنے بچھڑے دوست کو یاد کرتی رہتی ہے۔

زیب النسا کی یہ کہانی سبق آموز ہے۔ اس کہانی سے پتہ چلتا ہے کہ ہاتھ کی بڑی اہمیت ہے اور محنت سے ہی آدمی اندھیروں کو روشنی میں بدل سکتا ہے اور کامیابی کی نئی عبارت لکھ سکتا ہے۔

زیب النسا کی یہ چھوٹی سی کہانی ہے مگر بہت دلکش ہے، زبان بھی بچوں کی ذہنی سطح کے مطابق اور انداز بیاں تو بہت ہی پرکشش اور سحر انگیز ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بچوں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف ہیں اور ان کی ادراکی قوتوں کا بھی انھیں اندازہ ہے۔

اس کتاب کے علاوہ زیب النسا کی کئی اور کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں ام ہانی، رحم دل امین، خواب امین کا، کالی مچھلی کے دل میں کیا ہے اور رمضان آیا قابل ذکر ہیں۔

■

Haqqani Al- Qasmi
Mob.: 9891726444
Email.: haqqanialqasmi@gmail.com

چمن چمن کے پھول

شاعری میں بڑی طاقت ہے۔ اس سے تحریر وتقریر میں تاثیر پیدا ہوتی ہے، خطاب میں زور اور تحریر میں قوت پیدا کرنے کے لیے اشعار کا استعمال بہت کارگر ہوتا ہے۔ پرانے زمانے کے لوگوں کو استاد شعرا کے ہزاروں اشعار یاد ہوا کرتے تھے اور وہ موقعے کی مناسبت سے ان اشعار کا استعمال بھی کیا کرتے تھے۔

'چمن چمن کے پھول' میں مختلف رنگ اور شاعروں کے شعر اس لیے دیے جاتے ہیں تاکہ بچے موضوع کی مناسبت سے اچھے اشعار یاد کریں اور اپنی تحریر وتقریر میں اشعار کا موزوں اور برمحل استعمال کرسکیں۔ (ادارہ)

کسی کا درد ہو اپنا ہی درد ہے پیارے
جہاں جہاں بھی ملے غم بٹورتے جاؤ

جاں نثار اختر

وہ میرے گھر نہیں آتا میں اس کے گھر نہیں جاتا
مگر ان احتیاطوں سے تعلق مر نہیں جاتا

وسیم بریلوی

مرے چراغ الگ ہوں ترے چراغ الگ
مگر اجالا تو پھر بھی جدا نہیں ہوتا

وسیم بریلوی

وہ اور بزم ہے جس میں چراغ جلتے ہیں
یہاں تو اپنے ہی دل اور دماغ جلتے ہیں

خورشید الاسلام

گھر سے خوشبو کے تعاقب میں نکلنے والو
مری مانند کہیں تم بھی نہ بے گھر ہونا

حسن اکبر کمال

وہ کرے بات تو ہر لفظ سے خوشبو آئے
ایسی بولی وہی بولے جسے اردو آئے

احمد وصی

ہم چراغوں کو روشنی دیں گے
تم ہواؤں کے کان بھر دینا

سلیم محی الدین

ماں کی ممتا نے کبھی ہم کو بھٹکنے نہ دیا
پاؤں چومے تو دعاؤں کے خزانے نکلے

راشد راہی

محبت یاد رکھتا ہوں میں نفرت بھول جاتا ہوں
ملی ہے دوستوں سے جو اذیت بھول جاتا ہوں

اسحاق خضر

گھر کا رشتہ عجیب رشتہ ہے
گل سے نکلی تو مر گئی خوشبو

نیاز

گھر تو ایسا کہاں کا تھا لیکن
در بہ در ہیں تو یاد آتا ہے

اقبال فریدی

■

ماخذ: شعرستان (برائے بیت بازی)، مرتب: ڈاکٹر عائشہ سمن، الفاظ پبلی کیشن، سنہ اشاعت: 2019

محمد فیض خان منور خان، درجہ ششم، نبا انگلش اسکول، اورنگ آباد، مہاراشٹر

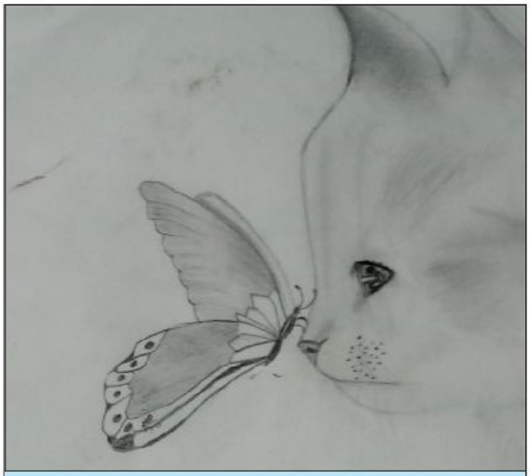

الیس زاری ایچ زیدی، درجہ چہارم
این این جھا اسکول، بشنوئی پور، اولڈ بلیا، یوپی

شاہینہ صدیقی شیدا بگھونوی، شاہ پور بگھونوی، سمستی پور، بہار

سید معزالدین بن شمس الدین، درجہ دوم، پرلینٹ اورینٹل اسکول پکا تالاب، فتح پور، یوپی

یحییٰ حارث، درجہ چہارم، مدرسہ جامعۃ المعارف

ماہین ایم بھیروادگی، درجہ پنجم، نوبل وژن اسکول، بیجاپور، کرناٹک

ایک کلک پر ادب اطفال کا بیش بہا خزانہ

پیارے بچو! آپ کے ذوق کی کتابیں اگر نہیں مل پا رہی ہیں تو مایوس نہ ہوں۔ قومی اردو کونسل کے موبائل ایپ (ekitaab) اور ویب سائٹ (https://www.urducouncil.nic.in/) پر آپ کے لیے بہت سی مفید کتابیں موجود ہیں۔ اسے آپ ڈاؤن لوڈ کر کے پڑھ سکتے ہیں۔

BACHON KI DUNIYA Monthly, February 2021 Vol. 09, Issue: 02
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439/2019-21
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/01/2021
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دلچسپ کتابیں

صفحات:112، قیمت:25 روپے

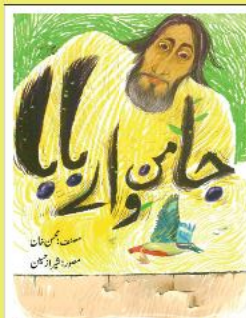

صفحات:12 ، قیمت:20 روپے

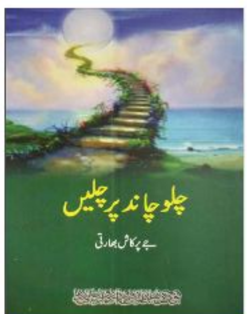

صفحات:48، قیمت:16 روپے

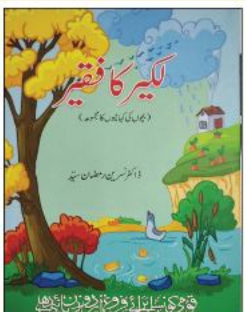

صفحات:82، قیمت:35 روپے

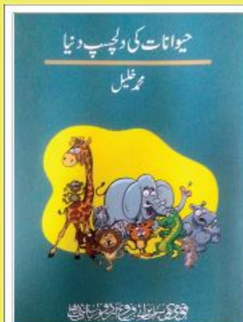

صفحات:83، قیمت:24 روپے

صفحات:61، قیمت:20 روپے

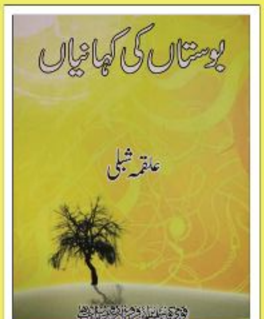

صفحات:87، قیمت:20 روپے

صفحات:61، قیمت:20 روپے

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066–

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.